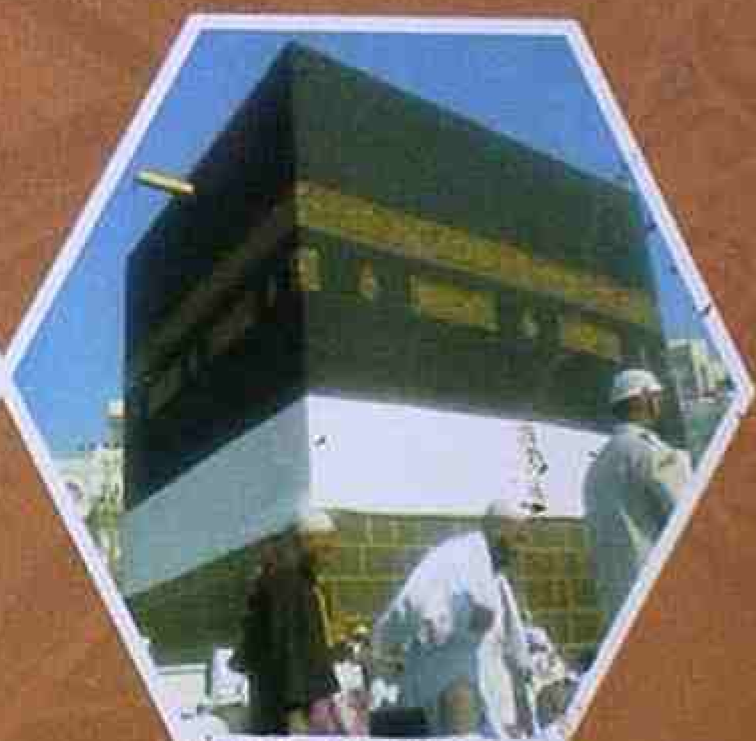
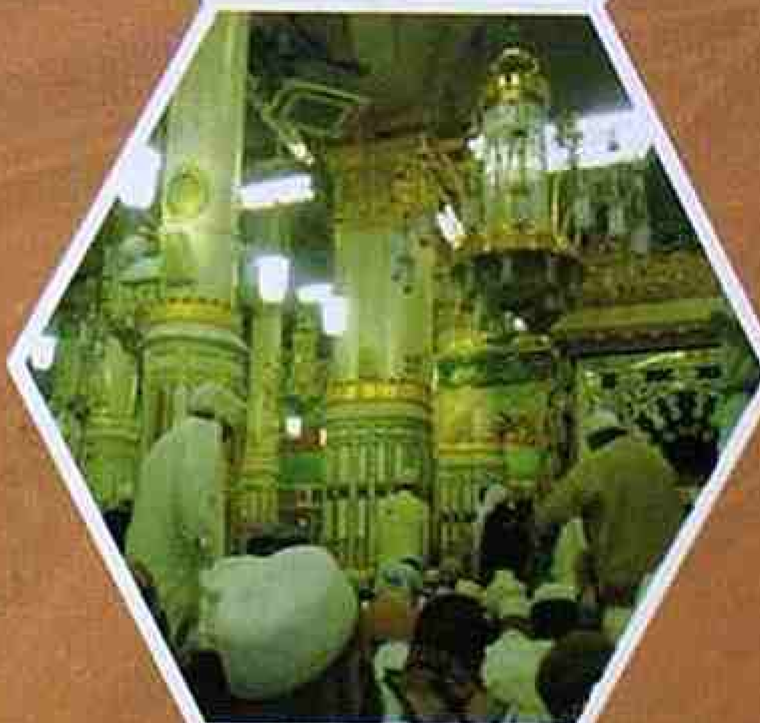
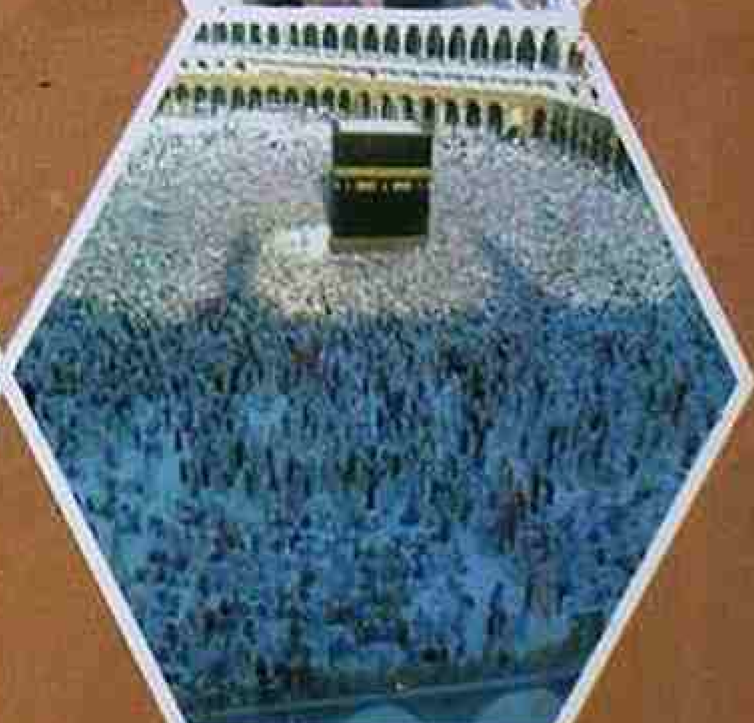
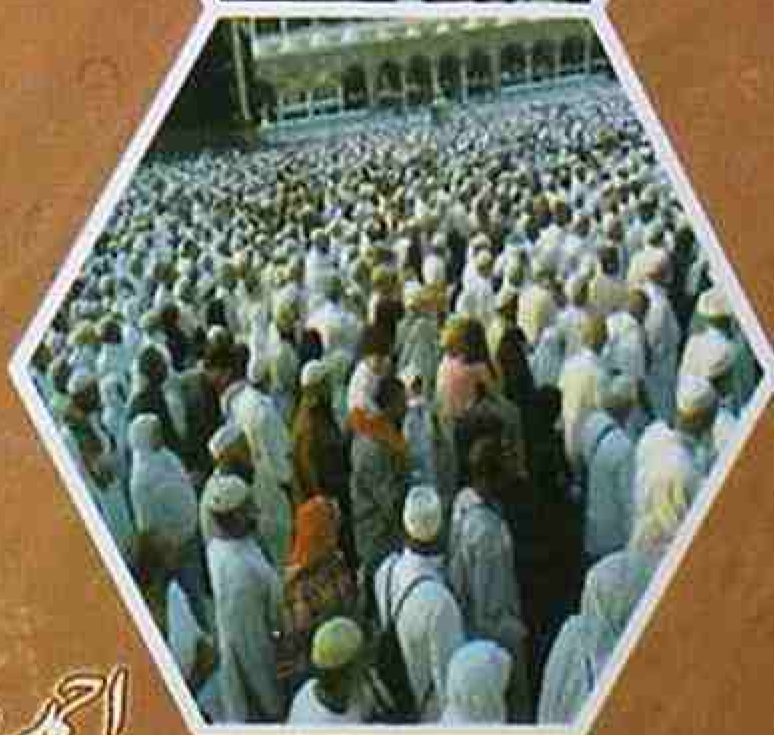
...کہاں سے لوٹ آئے !


احمد بدر

...کہاں سے لوٹ آئے

(سفر نامۂ حج)



(اس کتاب کی اشاعت میں کسی سرکاری یا غیر سرکاری ادارے کا مالی تعاون شامل نہیں ہے۔)



Kahañ se laut aaye

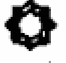
(Hajj Travelogue)

By

Ahmad Badr



سال اشاعت : 2012



تعداد اشاعت : 500



قیمت : 100 روپے



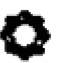
کمپوزنگ : گوہر عزیز



مطبع : پارس پبلیکیشن پرائیوٹ لیمیٹڈ، حاجی پور



سرورق کی تصاویر : احمد بدر (بذریعہ موبائل)



سرورق کی ڈیزائننگ : صادق (ڈیجیٹل ڈسٹینیشن، جمشید پور)



ناشر

خانقاہ منعمیہ، میتن گھاٹ، پٹنہ سٹی

انتساب

ان

تمام لوگوں کے نام

جنہوں نے

میرے لیے

دعائیں کی ھیں!

اور

اس شعر کے نام

آ رہی ہے اک آشنا آواز
بیخودی، ہم کہاں سے لوٹ آئے

(احسان دانش)

نذر ثریا

بے کم و کاست

حج بیت اللہ شریف اور زیارت مدینہ منورہ کی تفصیلات پر مشتمل یہ سفرنامہ ویسا ہی ہے جیسا ہاتھی کو دیکھنے کے بعد کسی اندھے کا بیان۔ میں نے بھی اس سفر میں صرف وہی دیکھا جو اس وقت میرے گرد و پیش میں تھا اور جن کی طرف میری توجہ چلی گئی ع ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا۔

ہاں ایسا لگتا ہے کہ میری توجہ کچھ ایسی باتوں پر ضرور گئی جنہیں لوگ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ویسے بھی تسبیح و تہلیل میں مصروف لوگوں یہ سب دیکھنے کی فرصت کہاں تھی۔

یہ جو کچھ آپ کے سامنے ہے اس کا زیادہ تر حصہ دوران سفر ہی لکھا گیا اسی لیے ممکن ہے اس تحریر میں وہ فنکارانہ رچاو یا انداز بیان میں وہ پختگی نہ ملے جو بڑی محنت سے پیدا کی جاتی ہے لیکن ایک طرح کی واقعیت اور بے ساختگی ضرور محسوس ہوگی۔ بلکہ اگر کسی باشعور قاری کے منھ سے صرف اتنا نکل جائے کہ یہ حج کے دوسرے سفرناموں سے الگ ہے تو میں سمجھوں گا میری محنت وصول ہوگئی۔

میں اس سفرنامے کی تحریک کے لیے برادرم سراج اجملی، اس کی اشاعت کے لیے مسلسل یاد دہانی کرانے کے لیے منظر کلیم، یحییٰ ابراہیم، عقیل احمد اور رضوان الزماں صاحبان، اس کی کمپوزنگ میں تعاون دینے کے لیے برادرم گوہر عزیز، اس کو پڑھ کر اپنے تحریری تاثر سے سرفراز کرنے کے لیے جناب اسلم بدر اور صرف چند صفحات پڑھ کر اس کے بارے میں بہت اچھی رائے قائم کر لینے والے ڈاکٹر محمد زکریا کے علاوہ ان سب کے لیے اظہار ممنونیت کرتا ہوں جو اس کی جلد اشاعت کا تقاضہ کرتے رہے۔

احمد بدرؔ

احمد بدر کا زیارتی انشائیہ

اسلم بدر

احمد بدر جہاں سے لوٹ آئے ہیں وہاں کا ہر مسافر، لوٹنے کے بعد بھی مدتوں وہیں موجود رہتا ہے۔ نگاہوں میں وہیں کی تصویریں، تصور میں وہیں کی پرچھائیاں، گفتگو میں وہیں کا ذکر، نیندوں میں وہیں کے خواب، نمازوں میں کبھی سیاہ غلاف، کبھی سفید مطاف، کبھی بھنور نما طواف، کبھی سبز گنبد، کبھی سنہری جالیاں۔ اور پھر رفتہ رفتہ خواب و خیال کے آئینے پر حالات کی گرد جمنے لگتی ہے، تصویریں یادوں کی دھند میں چھپنے لگتی ہیں۔ بُت تو سبھی ٹوٹ چکے تھے۔ ذات کا بُت، علمیت کا بُت، شہرت کا بُت ... صرف ٹوٹے تھے، تحلیل کہاں ہوئے تھے۔ بکھرا ہوا غبار سمٹنے لگتا ہے، شکلیں ابھرنے لگتی ہیں۔ مگر دھند میں کھویا ہوا مسافر بہت کچھ بھولنے کے بعد بھی سیاہ غلاف اور سبز گنبد نہیں بھولتا۔

احمد بدر صاحب اردو زبان و ادب کے استاد ہیں اس لئے یہ کتاب ادبی اور معلوماتی بھی ہے۔ بہت اچھے شاعر ہیں، اپنی سادہ و پرکار شاعری کی وجہ کر جانے مانے جاتے ہیں، سو اس کتاب کی نثر میں بھی وہی سادگی و پرکاری ہے اور پھر مضامین کے عنوان دیکھئے ــــ کچھ یاد رہا کچھ بھول گئے ــــ راکھ تلے اک چنگاری تھی ــــ اُدھر قدرت کے منصوبے جدا تھے ــــ منزل کا حال رخت سفر بولنے لگا، وغیرہ۔ نقاد و ادیب بھی ہیں اس لئے تحریر میں تنقید بھی ہے اور ادب بھی ــــ ''چپل اتارتے اتارتے وہ سلام پھیر چکا تھا'' ــــ ''عربی میں جبل الرحمہ اور چھ زبانوں میں اس کا ترجمہ لکھا ہوا تھا۔ اردو میں لکھا تھا، رحمت کا پحاڑ'۔ اتنے سارے اردو دانوں کو یہ 'پہاڑ' جیسی غلطی دکھائی نہیں دیتی۔'' ان تمام خصوصیات کے علاوہ موصوف ایک باعمل دیندار انسان ہیں۔ وہ بھی جانتے ہیں کہ توانائی غبار کی تجسیم میں دیر نہیں لگتی۔ اس سے پہلے کہ

ایسا ہو، اپنے خوابوں کو بدن اور جذبوں کو پیرہن دے دیا جائے۔ سو' کہاں سے لوٹ آئے' آپ کے ہاتھوں میں ہے، خود ان کے ہاتھوں میں بھی رہے گی۔ گاہے بگاہے اسے کھولتے بند کرتے رہیں گے تاکہ آئینہ عکاسیاں کرتا رہے۔ بعض لوگ اس کے لیے، بقول مصنف، 'چھ حج، چھیالیس عمرے' کر گذرتے ہیں، آئینہ پھر بھی شفاف نہیں ہو پاتا۔

احمد بدر کی یہ کتاب محض ایک سفر کا بیان نہیں ہے، نہ ہی یہ حج و عمرہ کی گائیڈ بک، نہ ہی مستجاب دعاؤں اور وظیفوں کا مرقع۔ تحریر کی سادگی، دلچسپ اظہار اور تسلسل واقعات کتاب کی اصل خصوصیات ہیں۔ انداز بیان ایسا کہ ایک بار ہاتھ میں لیا تو چھوڑنا مشکل۔ شاید کسی انشائیہ سے گذرتے ہوئے بھی قاری کے انہماک کا عالم کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ مگر اسے محض انشائیہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہاں آوارہ خیالی نہیں ہے، واقعات کی کڑیاں کہیں ٹوٹی نہیں ہیں اور مقصد تحریر کے تمام جوہر اپنے مرکز کے گرد ہی رقص میں مگن ہیں۔ کہیں کہیں مصنف نے انشائیے جیسی کیفیت ضرور پیدا کی ہے تاکہ دلچسپی برقرار رہے اور کتاب ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ مثال کے طور پر ہوائی جہاز کا وہ بنگالی ــــ ''ای جو سات تو بوک (طبق) آسمان بولتا ہے تو پہلا تو بوک یہی ہے کیا؟'' ۔ سفر حج کے رہنماؤں سے ناراض وہ دیہاتی ــــ ''ہمرا بیڑی کا سب بنڈل اور ماچس بیگ میں رکھوا دیا، بولتا ہے جدہ میں ملے گا۔ ہمرا جی کیسا کیسا کر رہا ہے، ہم نہیں جائے گا، ہمرا پیسہ واپس کر دو۔'' ایام تشریق میں منیٰ کے مچھر ــــ ''منیٰ کے خیمے میں اکا دکا مچھر گھومتے دکھائی دیے، گویا حاجیوں کا امتحان لینے نکلے ہوں۔ مجھے مارو اور دم دو۔'' یا پھر ــــ ''لوگ یہاں لبیک لبیک کہتے ہوئے آتے ہیں اور یہاں پہنچ کر البیک البیک کہنے لگتے ہیں''۔ یا پھر حاجیوں کے واپس پہنچتے ہی ــــ ''مغرب کی پہلی نماز قضا ہو چکی ہے اور ہم میں سے بیشتر حاجی لال بیگ ،کالا بیگ، لال بیگ، کالا بیگ میں الجھے رہ گئے۔'' مزاح ایسا کہ ہنسی تو آئی مگر آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ کہیں کہیں تو موصوف نے ایک جملے میں پوری داستان سمیٹ لی ہے ــــ ''اس وقت تو

اللہ کا نام لینے والے گنتی کے تھے اور اللہ نے ابابیلوں سے یہ کام لے لیا۔ ہم کروڑوں کی تعداد میں تھے پھر بھی ابابیلوں کا انتظار کرتے رہ گئے اور آج بھی کر رہے ہیں"۔۔۔ یہ انداز بھی ملاحظہ فرمائیں کہ رمی جمار کرتے ہوئے شیطان کو اپنا چہرہ کھول کر دکھا رہے ہیں (تاکہ مارنے والے کا چہرہ دکھائی دے اور سند رہے)۔ تاکہ میدان محشر میں جب شیطان کے قہقہے کی آواز گونجے گی تو وہاں بھی اپنا چہرہ دکھاتے ہوئے کہتیں۔۔۔ "دیکھ لے مردود! میں وہی ہوں جس نے تجھے سنگسار کیا تھا۔"

میں محض دس بارہ دنوں کے لئے شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ جانے سے قبل احمد بدر سے ملاقات ہوئی تو کہنے لگے حج کا ارادہ ہے، مگر درخواست جمع نہیں کی ہے، آخری تاریخ ختم ہو چکی ہے، پھر بھی جاؤں گا، انشاء اللہ۔ میں حیرت سے انہیں تک رہا تھا، جب سب کچھ ختم ہو چکا ہے تو ارادہ کیسا؟ سفر سے واپس لوٹا تو جناب سفر حج کی تیاریوں کے لئے پٹنہ جا چکے تھے۔ معلوم ہوا کہ حج محض خواہش، ارادہ، دولت و امارت سے نہیں ہوتا۔ مقدور کے ساتھ مقدر، منشائے الٰہی، مشیت خداوندی کے علاوہ کسی حد تک ضدی طبیعت بھی کام آتی ہے۔

میں احمد بدر نام کے اُس شریر بچے کو مبارکباد پیش کرتا ہوں، جس کی ہر خواہش اس لیے بھی پوری کر دی گئی ہے تاکہ وہ شور نہ کرے۔ میں الحاج احمد بدر کو حج کے ساتھ ساتھ ان کی اس ۔۔۔ نثر شورانگیز۔۔۔ کے لیے بھی مبارکباد پیش کرتا ہوں جس کی سادگی میں پرکاری، سنجیدگی میں گلکاری اور جس کی خاموش سطح آب میں تہ بہ تہ زیریں لہروں کا شور بھی ہے اور کاٹ بھی۔

انشائیہ کی کئی قسمیں ہوتی ہیں ...ادبی انشائیہ، تاریخی انشائیہ، سوانحی انشائیہ، وغیرہ۔ مجھے اگر اسے انشائیہ ہی کہنا ہو تو میں اس کتاب کو زیارتی انشائیہ کہوں گا۔

جمشید پور

۲۲ اپریل ۲۰۱۲ء

کچھ یاد رہا کچھ بھول گئے

دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا مسلمان ہوگا جو (خواہ مالی استطاعت رکھتا ہو یا نہیں) حجِ بیت اللہ کی خواہش نہ رکھتا ہو۔ بچپن سے اب تک جب بھی کسی کے حج پر جانے یا لوٹنے کا ذکر ہوا، جانے انجانے یہ خیال بھی دبے چھپے انداز میں سر اُٹھاتا رہا کہ 'کاش ہم بھی جاتے'۔ میری پیدائش 1960ء کی ہے اور بچپن 1967ء تک رانچی میں بیتا، جہاں والد کی پوسٹنگ سی.آئی.ڈی. کے محکمے میں تھی۔ اس دوران دادیہال، مظفر پور اور نانیہال، پٹنہ آنا جانا ہوتا رہتا تھا، خصوصاً چھٹیوں میں۔ رانچی میں مکان مالک حاجی لعل محمد تھے۔ ان کے منھ سے بھی کبھی کبھار 'مکہ مدینہ' کا ذکر سننا حافظے میں محفوظ ہے۔ مظفر پور میں آبائی مکان واقع موضع محمد پور مبارک میں گھر کے سامنے مسجد پر کندہ پردادا کا نام 'خادمِ مسجد ہٰذا حاجی سید قاسم علی بن سید منور علی' بچپن سے ہی دیکھتا رہا۔ یہ بھی بارہا سنا کہ اس مسجد کا نقشہ وہ مکہ سے لے کر آئے تھے۔

دادا سید محمد شوکتؔ مظفر پوری نے حج نہیں کیا تھا اور جب سے میں نے انہیں دیکھا تو کافی ضعیف تھے اور انکی بصارت زائل ہو چکی تھی۔ نعت گوئی سے انتہائی شغف تھا اور نعت کے اشعار میں اکثر یا تو مدینہ منورہ جانے کا شوق یا نہیں جا پانے کی کسک موجود رہتی تھی:

مدینہ جاؤں، مدینے سے آؤں، پھر جاؤں
تمام عمر اسی میں تمام ہو جائے

ہم ہند میں بھی رہ کے شوکتؔ طیبہ ہی میں گویا رہتے ہیں
جنت میں ہمیں لے جانے کو یہ جذبہ ہمارا کافی ہے

ویسے بچپن سے ہی میرے شعور میں، مکہ اور مدینہ کا تصور الگ الگ نہیں ابھرا۔ نہ کبھی یہ ذہن میں آیا کہ حج کا مدینہ جانے سے کوئی تعلق نہیں، جیسا ان دنوں سننے میں آتا ہے یا جیسا کہ بعض لوگ شدت کے ساتھ مدینہ منورہ جانے کی نیت کرنے سے منع کرتے ہیں۔

پہلی بار ہوش گوش میں حج پر جانے کا جو منظر قریب سے دیکھا اور جس کی دھندلی سی یاد اب تک ذہن میں بسی ہے وہ نانا حضرت سید شاہ منظور رضوی منعمی (سجادہ نشین خانقاہ منعمیہ قمریہ میتن گھاٹ، پٹنہ سٹی) اور نانی مرحومہ زہرہ خاتون کا سفر مبارک تھا۔ یہ واقعہ 1965ء کا ہے تب پانی کے جہاز کا ہی بھروسا تھا اور کم وبیش چھ ماہ کا سفر ہوتا تھا۔ جب وہ واپس لوٹے اور بمبئی سے بذریعہ ٹرین پٹنہ پہنچے تو اسٹیشن پر اور لوگوں کے ساتھ میں بھی تھا۔ لوگوں کا اسٹیشن پر ہر ڈبے میں جھانکتے ہوئے دوڑنا، اپنے اعزاء واقرباء کے مل جانے پر مسرت آمیز نعرہ لگانا، پھر گلے مل کر کبھی رونا کبھی ہنسنا ـــــ سب ایک خواب کی طرح یاد آتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ پٹنہ جنکشن کے پلیٹ فارم پر مجھے ایک کنارے کھڑا کر دیا گیا تھا تاکہ بھیڑ کی زد میں نہ آجاؤں۔ ابا، ماموں، خالہ زاد بھائی اور عقیدتمندان وغیرہ نانا اور نانی کو ٹرین سے اتارنے اور سامان کو سواری پر بھجوانے میں مصروف تھے۔ حاجیوں کو ہار پہنائے جا رہے تھے۔ مصافحہ اور معانقہ کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔

گھر آنے کے بعد مہینوں سفر حج کی داستان قسطوں میں سنائی جاتی رہی۔ نانا مرحوم تو انتہائی کم سخن تھے اور کبھی کبھی ہی کوئی واقعہ بالتفصیل بیان کرتے لیکن نانی کے منہ سے اکثر بہت سی تفصیلات سننے کو ملتیں، بلکہ پچیس تیس سال بعد بھی، جب تک وہ زندہ رہیں، ان سے اصرار کر کے بعض واقعات بار بار سنے جاتے تھے اور وہ ہر بار اسی طرح سے اور انہیں الفاظ میں وہی واقعات سناتی تھیں۔ لیکن میرے لیے اس سفر کا حاصل ایک پلاسٹک کا کیمرہ نما کھلونا تھا جس میں آنکھ لگا کر دیکھنے پر خانہ کعبہ، مقام ابراہیم، طواف اور سعی کا منظر، روضۂ رسول اقدس ﷺ وغیرہ

کی رنگین تصویریں دکھائی دیتی تھیں اور انہیں آگے پیچھے کر کے اپنی پسند کی تصویر دیکھی جا سکتی تھی۔ آج کے اعتبار سے دیکھیں تو یہ انتہائی معمولی سی چیز تھی لیکن 66-1965 میں ایک پانچ چھ سال کے بچے کے لیے یہ بیش بہا دولت تھی اور اس کے ساتھ ہی یہ احساس بھی تھا کہ میرے آس پاس کے میری عمر کے کسی بچے کے پاس یہ نادر چیز نہیں ہے۔ میں جسے چاہوں اسے اس میں جھانکنے کا موقع دوں اور جتنی دیر تک چاہوں اتنی ہی دیر تک دوں۔

دھیرے دھیرے خاندان میں حاجیوں کی تعداد بڑھتی گئی کم و بیش ہر سال دور اور نزدیک کے رشتہ دار حج بیت اللہ کی سعادت سے مشرف ہوتے رہے۔ لیکن یہ بھی اتفاق تھا کہ نہ والد اور نہ انکے دونوں سگے بھائی یہ فریضہ انجام دے سکے اور نہ ہی دونوں ماموں۔ اس کی تلافی کافی حد تک ماموں زاد بھائی سید شاہ شمیم منعمی (سجادہ نشیں، خانقاہ منعمیہ، میتن گھاٹ، پٹنہ سٹی) نے کی جب وہ 2003ء میں 39 سال کی عمر میں اس مبارک سفر سے شادکام ہوئے۔ وہ میری جانکاری میں خاندان کے سب سے کم عمر حاجی تھے۔ حالانکہ یہ رکارڈ زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکا اور 2007ء میں جب وہ دوبارہ حج و زیارت کے لیے عازمِ سفر ہوئے تو ان کے ساتھ ان کی والدہ، اہلیہ اور تین سال کے صاحبزادے حسن دائم بھی شریک سفر تھے۔ اس عمر میں قائم کیا گیا یہ رکارڈ آسانی سے ٹوٹتا نظر نہیں آتا۔ سونے پر سہاگا یہ کہ امسال 2010ء میں جب شمیم منعمی اپنا تیسرا حج کر رہے ہیں تو عزیزی حسن دائم بھی ساتویں سال میں اپنا دوسرا حج کر رہے ہیں:

این سعادت بزورِ بازو نیست

راکھ تلے اک چنگاری تھی

دل میں سوئی ہوئی خواہش سے صرف نظر کریں تو یہ ایک سچائی ہے کہ میں نے نہ کبھی حج کے لیے کوئی پروگرام بنایا نہ تیاری کی۔ ہاں گذشتہ ایام پر ایک نگاہ ڈالتا ہوں تو ایک چنگاری ضرور دکھائی دیتی ہے جو کم وبیش چھ برسوں تک سلگتی رہی۔ یہ چنگاری پروفیسر مستجاب علی خاں کی لگائی ہوئی تھی۔

خان صاحب کریم سٹی کالج جمشید پور میں صدرِ شعبۂ انگریزی تھے۔ میں بھی 2003ء کے نومبر میں اسی کالج کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہوا۔ تین ماہ بعد ہی دیگر دو اساتذہ کے ساتھ خان صاحب بھی سبکدوش ہو گئے۔ اس کم مدت کی رفاقت کے باوجود مجھے عزیز رکھتے ہیں۔ اسی لیے کبھی کبھی میں ان سے ملاقات کا شرف حاصل کرنے حاضر ہوا کرتا تھا۔ جب وہ حج سے لوٹے تو میں بھی جا کر ملا۔ سفر کی تفصیلات و قلبی کیفیات کے ساتھ ساتھ انہوں نے رو میں ایک بات کہہ دی — ''اور پہلے جانا چاہیے تھا۔ اس عمر میں تو رسم ادائیگی ہی ہوتی ہے۔ آپ کی عمر میں جانا چاہیے۔ ابھی تو آپ کی تنخواہ نہیں آئی ہوگی۔ اس میں وقت لگے گا۔ لیکن جب بقایہ تنخواہ آ جائے تو حج کر لیجیے گا۔''

آج غور کرتا ہوں تو لگتا ہے کہ یہ بات نہ میں نے کسی سے دہرائی نہ خود ہی اس پر کوئی غور وخوض کیا، لیکن یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ کہ یہ کہیں نہ کہیں تحت الشعور میں بیٹھی تھی اور اثر انداز بھی ہو رہی تھی۔

جھارکھنڈ ریاست کا نیا نیا قیام ہوا تھا۔ ہر چیز ابھی تشکیلی دور سے گزر رہی تھی۔ یہی وجہ

تھی کہ ہم کوششیں کرتے رہے لیکن ہماری فائل کالج سے یونیورسٹی، یونیورسٹی سے جھارکھنڈ پبلک سروس کمیشن، جھارکھنڈ پبلک سروس کمیشن سے ڈیپارٹمنٹ آف ہائر ایجوکیشن کے بیچ کٹی پتنگ کی طرح ڈولتی رہی۔

سات سال کے بعد جھارکھنڈ سرکار نے بقایہ تنخواہ کا ایک حصہ ریلیز کیا۔ اس دوران کالج سے جزوی تنخواہ بطور قرض مل رہی تھی۔ جتنے دنوں کی بقایہ تنخواہ آئی اس رقم میں سے کالج نے اس مدت میں جتنا روپیہ بطور قرض دیا تھا وہ وضع کرلیا۔ میں نے لکھ کر دیا کہ جس مدت کی تنخواہ ابھی سرکار سے نہیں آئی ہے اس دوران بھی کالج نے جو رقم قرض دی ہے وہ بھی وضع کر لی جائے۔ حالانکہ کالج اس پیسے کو ہر مہینہ قسطوں میں وصول کر رہا تھا، لیکن میں کیا کرتا۔ قرضدار ہونا بارِ خاطر تھا۔ پہلی بار کسی کا مقروض ہوا تھا اس لیے جلد از جلد چھٹکارے کی فکر تھی۔ دوسری وجہ شاید تحت الشعور میں بیٹھی ہوئی تھی یعنی 'مقروض رہ کر کوئی حج کیسے کرے گا' اس واقعہ کو بھی کئی مہینے گذر گئے لیکن اس بات نے شعور کے دروازے پر دستک نہیں دی۔ لوگوں کے حج پر جانے کے ارادے اور اس سلسلے میں ہوئی پیش رفت کی خبریں ملتی رہیں، ذکر ہوتا رہا لیکن شعور کے کان پر جوں نہیں رینگی۔

اُدھر قدرت کے منصوبے جدا تھے

2010 ستمبر کے مہینے کی 21 تاریخ تھی۔ بابری مسجد کے فیصلے پر لگائی جانے والی انکلوں اوراس کے اجرا کی متوقع تاریخ کے ٹلنے یا نہ ٹلنے کے اندازے لگانے میں ہی لوگوں کا بیشتر وقت گذر رہا تھا۔میں کالج کے اپنے کمرے میں یحیٰ ابراہیم (صدر شعبۂ انگریزی) کے ساتھ بیٹھا تھا اور سامنے تھے عزیزم رضوان الزماں۔ یہ براہِ راست میرے شاگرد تو نہیں کیونکہ کامرس پڑھتے رہے اور اردو سے کوئی خاص تعلق بھی نہیں پھر بھی تمام شاگردوں سے زیادہ عزیز ہیں۔ یہ ہمیشہ ہر مرض کی دوا ثابت ہوتے ہیں۔مسئلہ چھوٹا سے چھوٹا ہو یا بڑا سے بڑا، رضوان کا نام سب سے پہلے ذہن میں آتا ہے۔گفتگو کے دوران اچانک یاد آیا کہ چھ ماہ قبل پاسپورٹ کا فارم لانے کی بات ہوئی تھی۔میں نے ٹوک دیا۔رضوان کا جواب تھا کہ آپ کے لیے جو فارم لایا تھا وہ تو عقیل سر (شعبۂ فلسفہ کے استاد) نے لے لیا۔ان کی امّی کا پاسپورٹ بن کر آ بھی گیا۔ مجھے بھی یاد آیا کہ وہ تو اس سال حج پر جارہی ہیں۔ میں نے سوال کیا کہ میرا فارم کب آئے گا؟ رضوان کا جواب تیار تھا ـــــ

''ابھی آئے گا سر۔''

اس نے کسی کو فون کیا۔آدھے پون گھنٹے میں کوئی فارم دے گیا۔

باتوں باتوں میں طے ہوا کہ فارم ابھی بھر دیا جائے،کل اسے رانچی بھیج کر جمع کرا دیا جائے گا۔فارم بھر کر حوالے کرتے ہوئے میں یونہی پوچھ لیا ـــــ

''کب تک آجائے گا پاسپورٹ؟''

''چالیس پینتالیس دن میں آجائے گا۔سر۔'' پھر آہستہ سے ایک جملہ اچھال دیا —— ''چاہیے تو کل ہی مل جائے گا''

''کل؟'' —— سوال ذہن میں ابھرا اور جواب بھی ساتھ ساتھ کوند گیا —— 'تتکال!'

میں نے کہا —— ''تو یہی کرو نہ، ڈیڑھ مہینے تک کون انتظار کرے گا۔''

فیصلہ ہو گیا کہ تتکال کی اسکیم کے تحت ہی پاسپورٹ بنے گا۔ اب مرحلہ یہ تھا کہ پاسپورٹ فارم کے ساتھ ایک درخواست بھی دینی تھی۔ میں کمپیوٹر میں درخواست ٹائپ کرنے لگا۔ اس دوران بحث ہوتی رہی کہ پاسپورٹ میں جلدی کی وجہ کیا بتائی جائے۔ کافی ردوکد کے بعد طے ہوا کہ وجہ لکھی جائے —— 'حج کے لیے عرضی دینی ہے'۔ یہ محض تتکال کا ایک جواز تھا۔ اس میں اس وقت تک نہ ارادہ شامل تھا نہ نیت۔

دوسرے دن یعنی 22 ستمبر کی شام کو رضوان کا فون آیا —— ''سر! پاسپورٹ تو بن گیا۔ رانچی چلے گئے ہوتے تو ہاتھ کے ہاتھ لے لیتے۔ خیر کل ڈسپیچ ہو جائے گا۔'' حیرت آمیز خوشی ہوئی۔ 23 کو پھر رضوان سامنے بیٹھے تھے۔ میرے منھ سے نکلا کہ ''درخواست میں تو حج کی بات لکھ دی۔ اب کچھ کوشش بھی کرنی چاہیے نہ۔'' رضوان مسکرائے —— ''کیجیے کوشش، لیکن سارا مرحلہ تو ختم ہو چکا۔ جانے والوں کی تاریخیں آچکی ہیں، مسجدوں میں تربیتی کیمپ چل رہے ہیں، دس پندرہ دنوں میں فلائٹ شروع ہو جائے گی۔''

پھر بھی دل نہ مانا۔ کہیں نہ کہیں کوئی بات چبھ رہی تھی۔ اسلم بدرؔ صاحب کو فون لگایا۔ مدعا سنتے ہی چہک اٹھے۔ حاجی عبدالجبار صاحب (سابق سیفؔ مچھلی شہری) کا نمبر دیا اور کہا —— ''کوشش کیجیے، شاید کوئی صورت نکل آئے۔ انشاءاللہ!''

حاجی عبدالجبار صاحب نے حج کمیٹی کے سلسلے میں تو مایوسی ظاہر کی اور کہا کہ وقت نکل

گیا۔ جھارکھنڈ کا کوٹا خالی ہے لیکن اب درخواست قبول نہیں ہوگی۔ پرائیویٹ سے کوشش کیجیے۔ انہوں نے کلکتہ کا ایک نمبر دیا۔ ایک صاحب تھے جو کسی ٹریویل کمپنی کے مالک ہیں۔ وہاں بات ہوئی۔ جواب نفی میں تھا۔ بولے۔۔۔ ''دس دن قبل کہتے تو ہو جاتا''۔ انہوں نے بھی ایک نمبر دیا۔ وہاں سے بھی اسی سے ملتی جلتی بات کہی گئی۔ رضوان کو سا کچی جامع مسجد بھی بھیجا جہاں حج کمیٹی کا مقامی دفتر ہے۔ وہاں سے بھی ایسا ہی جواب ملا۔

ابھی تک خانہ پُری کی کاروائی ہو رہی تھی۔ ایک احساس جرم تھا کہ پاسپورٹ جلدی پانے کی وجہ حج بتائی ہے تو کوشش بھی کرنی چاہیے۔ دل مطمئن ہو رہا تھا کہ اپنی طرف سے تو کسر نہیں چھوڑی۔ سب کو فون کیا، سب سے بات کی۔ ایک دن اور گذرا۔ 24 ستمبر کی تاریخ تھی۔ اچانک ذہن میں آیا کہ عید کے آس پاس ایک SMS آیا تھا جس میں حج وعمرہ کے سلسلے میں رابطہ کرنے کا ذکر تھا۔ موبائل میں تلاش کیا۔ اتفاق سے یہ میسیج محفوظ تھا:

''آپ کو اور آپ کے گھر والوں کو ماڈرن ٹورز اینڈ ٹریویلس کی جانب سے تہہ دل سے عید مبارک !!! امسال حج کرنے کا سنہرا موقع۔ سیٹیں محدود ہیں''

ذہن میں آیا کہ نتیجہ تو معلوم ہی ہے۔ وقت گذر ہی چکا ہے۔ اتمامِ حجت کے طور پر یہاں بھی فون کرلیں۔ فون کے جواب میں آواز آئی۔۔۔ ''پہلے آپ کو کلکتہ آنا پڑے گا۔ تین چار سیٹیں خالی ہیں۔ دیر کیجیے گا تو گارنٹی نہیں لی جاسکتی۔ کب آرہے ہیں بتادیجیے''۔ یہ کوئی عتیق صاحب تھے۔

اب بساط پلٹ چکی تھی۔ میں دفاعی حالت میں تھا۔ پاسپورٹ جاری ہونے کی صرف اطلاع ملی تھی۔ پتہ نہیں کب ہاتھ میں ملے۔ کب کا وعدہ کروں؟ فوراً بہانہ بازی کرنی پڑی۔۔۔ ''جناب! میں ایک کالج میں پڑھاتا ہوں۔ پہلے چھٹی کی بات کرلوں۔ آپ سے دو ایک روز میں رابطہ کرتا ہوں''۔ فون منقطع ہوگیا۔

کمرے میں کوئی اور نہیں تھا۔ آنکھیں بند کر کے چند لمحوں تک سوچتا رہا۔ اللہ کا شکر ہے فیصلہ لینے میں مجھے کبھی زیادہ وقت نہیں لگتا۔ فیصلہ ہو گیا۔ بڑھا ہوا قدم پیچھے نہیں ہٹے گا۔ لیکن پاسپورٹ تو ہاتھ میں آجائے۔

25-26 اور 27 ستمبر ڈاکیے کی راہ تکتے ہوئے گذر گئے۔ اب فکر ہو رہی تھی کہ اگر کلکتہ فون کر کے عتیق صاحب سے بات کروں اور انہوں نے پاسپورٹ کا نمبر ہی پوچھ لیا تو کیا جواب دوں گا اور جس طرح سے وقت گزر رہا ہے اس میں بچی ہوئی سیٹوں کا کیا ہوگا۔ پھر ذہن میں آیا کہ جو باتیں اپنے اختیار میں نہیں ان پر سوچتے رہنا تضیع اوقات ہے۔ پاسپورٹ ہاتھ میں ہوگا تبھی بات ہوگی، تب تک خاموشی کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔

محبی ڈاکٹر افسر کاظمی کے معمولات میں روزانہ ڈاکخانہ کی زیارت بھی شامل ہے۔ ان سے گذارش کر دی تھی کہ ڈاکیے کے گوش گزار کر دیں میرے نام کوئی رجسٹری یا اسپیڈ پوسٹ آئے تو پہنچانے میں تاخیر نہ کرے۔ 28 ستمبر کو دوپہر ایک بجے ان کا فون آیا۔ ''بدر بھائی! آپ کا پاسپورٹ آگیا۔ ابھی آجایئے تو آپ کے ہاتھ میں مل جائے۔''

'یہ ڈاکیے بھی لفافے سے خط کا مضمون ہی نہیں مواد بھی بھانپ لیتے ہیں۔ دل چاہا کہ فوراً جا کر پاسپورٹ حاصل کر لوں لیکن معذرت کرنی پڑی کیونکہ اس وقت میں لوئلا کالج آف ایجوکیشن کے 'ٹرانسلیشن ڈے' میں مہمان خصوصی تھا اور پروگرام شروع ہونے ہی والا تھا۔ فون پر طے ہو گیا کہ ڈاکیہ میری مسجد کے امام صاحب کو لفافہ دے آئے گا۔

میں رات کو حسب معمول تقریباً دس بجے کمرے پر پہنچا۔ امام صاحب جا چکے تھے۔ دوسری صبح پاسپورٹ کی زیارت ہوئی۔ دوپہر میں کالج پہنچا تو رضوان بھی آگئے۔ پاسپورٹ کی جانچ پڑتال کی گئی کہ کوئی غلطی تو نہیں ہے جس کی وجہ سے آگے دشواری پیش آسکتی ہو۔ سب ٹھیک

ٹھاک تھا۔ مشورہ ہوا کہ اب ٹریول ایجنسی سے بات ہو سکتی ہے۔ فون لگایا۔ جو گفتگو ہو چکی تھی اسی کے حوالے سے بات شروع کی۔ عتیق صاحب نے سوال کے جواب میں سوال پوچھا۔۔۔

''کل کلکتہ آسکتے ہیں؟''

''ہاں، کیوں نہیں۔ لیکن کیوں؟''

''اس لیے کہ کل حاجیوں کے Vaccination کی آخری تاریخ ہے۔ کل کے بعد کچھ نہیں ہو سکتا۔ کل ٹیکا لگ جائے تو بقیہ ہم سنبھال لیں گے۔''

پیچھے ہٹنے کا سوال ہی نہیں تھا سو کہہ دیا۔۔۔

''صبح گیارہ بجے تک حج ہاؤس میں ملاقات ہو رہی ہے۔ انشاءاللہ!''

دماغ میں ایک بات کھٹک رہی تھی۔ ٹیکا تو ان کو لگتا ہے جن کے جانے کا قطعی فیصلہ ہو چکا ہو، ویزا مل چکا ہو، ٹکٹ بن چکا ہو۔ میں نے تو ابھی درخواست بھی نہیں دی ہے۔ ایسے میں ٹیکا کیسے لگے گا۔ پھر وہی خیال آیا کہ جس بات میں اپنا کوئی دخل نہیں اس میں سوچنے کی ضرورت کیا ہے۔ یہ ضرور سوچا کہ اگر کچھ نہیں بھی ہوا تو کیا بگڑ جائے گا۔ کولکاتا میں چھوٹی بہن اور اس کے بچے ہیں، مل کر چلا آؤں گا۔

فوراً پرنسپل ڈاکٹر محمد زکریا صاحب کے پاس گیا۔ پاسپورٹ دکھایا۔ ان کو بھی حیرت ہوئی کیونکہ چند دن قبل انہیں کا قلم لے کر پاسپورٹ فارم کی تصویر پر دستخط کیے تھے۔ پھر ایک دن کی چھٹی کولکاتا جانے کے لیے مانگی، وجہ بھی بتا دی۔ اچھل پڑے۔ ذہین آدمی ہیں، فوراً سمجھ گئے کہ سامنے والا صرف ایک دن کی چھٹی نہیں مانگ رہا ہے، تقریباً ایک ماہ کی چھٹی منظور کرانے کی تمہید باندھ رہا ہے۔ مسکرائے اور بولے۔۔۔

''کچھ مت سوچیے ارادہ کرلیا ہے تو چلے جائیے۔ اللہ مبارک کرے!''

چھٹی کی درخواست دی۔ رضوان نے فون کر کے اپنا اور میرا ٹکٹ بنانے کو کہہ دیا اور طے ہوگیا کہ صبح چھ بجے دونوں اسٹیشن پر ملیں گے۔

رفتہ رفتہ کچھ لوگوں کو جانکاری ہوتی گئی۔ اس بات پر تو سب کو خوشی تھی کہ حج کی سبیل پیدا ہوگئی ہے۔ لیکن 30 ستمبر کو جمشید پور چھوڑنے اور کولکاتا جانے کی بات پر کئی لوگوں نے تشویش کا اظہار بھی کیا۔ تھوڑی فکر تو ضرور ہو رہی تھی۔ بابری مسجد کے فیصلے کا دن تھا۔ میڈیا نے ہوا کچھ ایسی باندھ رکھی تھی کہ گویا کچھ نہ ہونے پر سب کو مایوسی ہوگی۔ کئی لوگوں نے طے کر رکھا تھا کہ پورا دن گھر سے باہر نہیں نکلیں گے۔ کئی لوگوں نے اپنے اپنے ٹکٹ کینسل کرائے تھے۔ میں نے اپنا صبح کا پروگرام فائنل رکھا۔

روح کا شکریہ

کولکاتا کے حج ہاؤس کے سامنے سے بیسوں بار گذرنے کا اتفاق ہوا تھا۔ کیونکہ اس سے بیس گز کے فاصلے پر میری چھوٹی بہن کی رہائش ہے لیکن اس کے اندر داخل ہونے کی نوبت آج ہی آئی تھی ۔ میں اور رضوان اندر پہنچ کر ادھر اُدھر نگاہ دوڑانے لگے کہ عتیق صاحب کو کیسے تلاش کریں۔ شکل وصورت سے تو واقفیت تھی نہیں۔ دومنٹ کے اندر ایک فعال ومتحرک نوجوان پر نگاہ ٹک گئی کیونکہ اس کے منھ سے دو بار 'عتیق بھائی' نکلا۔ براہِ راست پوچھ لیا اور اپنا تعارف دیا۔ اس کے جواب سے اندازہ ہوا کہ وہ اسی فرم سے نہ صرف یہ کہ متعلق ہیں بلکہ میرے آنے کے سلسلے میں واقفیت بھی رکھتے ہیں۔ قدرے اطمینان ہوا۔ یہ عارف عالم تھے انہوں نے بیٹھنے اور تھوڑی دیر انتظار کرنے کو کہا۔

یہاں بہت چہل پہل تھی۔ اوپر کے ہال میں عازمین حج کا مجمع تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر پر ایک شخص کارڈلیس مائک میں آٹھ دس نمبر پکارتے ـــــ اکتالیس، بیالیس، تینتالیس، چوالیس.....اور کچھ لوگ اٹھ کر اندر کمرے میں چلے جاتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد کچھ تو نارمل طریقے سے برآمد ہوتے تھے اور کچھ اپنا بازو ہاتھ سے دبائے ایسی شکل بنائے باہر آتے تھے گویا کوئی ڈراونی فلم دیکھی ہو۔

میرے اور رضوان کے درمیان گرد وپیش کے ماحول پر رواں تبصرہ چل رہا تھا اور نگاہ عارف عالم پر ٹکی ہوئی تھی ۔ اسی دوران ایک اور خوش رو اور خوش وضع نوجوان بڑی سرگرمی کے ساتھ عارف عالم کی سرگرمیوں میں شریک ہوگئے، بلکہ اندازہ ہوا کہ وہ عارف صاحب کو ہدایات بھی دے رہے ہیں۔ پہلے صرف شبہ ہوا اور بعد میں تصدیق ہوگئی کہ یہی عتیق احمد ہیں۔

ملاقات ہوئی۔ انہوں نے پاسپورٹ لے لیا، تھوڑا انتظار کرنے کو کہا اور اطمینان دلایا کہ وہ اپنی ایجنسی کے توسط سے جانے والے عازمین حج کو ٹیکا دلوانے کا علیٰحدہ نظم کر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں اندازہ ہو گیا کہ وہ کسی طرح میرا نام فہرست میں شامل کرنے کی کوشش بھی کر رہے ہیں۔ فہرست یقیناً پہلے جمع ہو گئی ہو گی اور اسی کے مطابق ٹیکا دلانے والوں کے کارڈ بن چکے تھے اب کسی کا نیا نام شامل کرنا شاید بہت آسان نہیں تھا۔ مجھے تھوڑی دیر کے لیے بنگال پر غصہ آیا۔ بہار ہوتا تو میں کسی شخص کے کارڈ پر بغیر ٹیکا لگوائے ہی دستخط اور مہر کرا کر لے آتا۔ میں نے کئی لوگوں کو کہتے سنا ہے ـــــ ''کسی نے پوچھا بھی نہیں کہ ٹیکا لیجیے گا یا نہیں۔ مہر مار کر دستخط کر دیا اور کہا ـــــ ''جایئے۔'' بہار میں تو اس کارڈ پر تصویر بھی نہیں رہتی۔ یہاں تو تصویر بھی چپکانی تھی۔ یہ بھی تب معلوم ہوا جب عارف اور عتیق صاحبان ایک پیلا کارڈ لیے ہوئے آئے اور کہا کہ اس ہال میں بیٹھ جایئے۔ اسی کو دکھا کر اندر جایئے گا۔ پھر دو نیلے کارڈ اور دیے جن پر میری تفصیلات لکھی تھیں اور کہا کہ ان پر اپنی تصویر چپکا لیجیے۔ اب میرے پاس تصویر کہاں سے آتی۔ رضوان نے حسبِ معمول اپنی خدمات پیش کر دیں ـــــ ''میرے پاس ایک تصویر ہے میں کمپیوٹر سے اس کی کاپیاں بنوا لاتا ہوں۔ آپ لائن میں بیٹھے رہیے۔''

اسی دوران ویکسین ختم ہو گئی۔ شاید آخری دن سارے چھوٹے ہوئے (اور میرے جیسے چھٹے ہوئے) بھی آ گئے تھے۔ پتہ چلا ایک کارکن محکمۂ صحت کے دفتر گیا ہے جلد ہی ویکسین لے کر آئے گا۔ اس کے جانے آنے میں آدھا پون گھنٹہ لگ گیا جب تک میری تصویر بھی بن کر آ چکی تھی۔ تھوڑی دیر میں اندر بلا لیا گیا اور ایک محترمہ نے بازو میں انجکشن لگایا، ایک حضرت نے منہ میں ایک بدمزہ دوا کے دو چار قطرے ٹپکائے اور جناب، ہو گیا ویکسی نیشن!

زیادہ تر لوگوں کے چہرے پر اطمینان جلوہ گر تھا کیوں کہ وہ اب اس آخری مرحلے سے بھی گذر چلے تھے۔ اب وہ سکون سے اپنے اس متبرک سفر کی تیاریوں میں مصروف ہو جائیں

گے۔لیکن میرا معاملہ تو 'ہنوز روزِ اول است' کے مصداق تھا۔آخری مرحلے سے گذرنے کے باوجود پہلا مرحلہ شروع بھی نہیں ہوا تھا۔دل میں بات آئی کہ جو اوّل بھی ہے اور آخر بھی، اس کی مرضی میں کس کا دخل؟ چاہے تو اخیر سے شروعات کردے۔اسی دوران ایک اور وجیہ وسفید ریش شخصیت نگاہ میں آئی۔بدانتظامی اور تاخیر پر غصے میں تھے۔تھوڑی دیر بعد عتیق صاحب نے ملوایا۔۔۔"یہ میرے والد ہیں نفیس صاحب۔"

وہیں یہ بات بھی سامنے آئی کہ دونوں باپ بیٹے ایک ایک ٹریول ایجنسی چلاتے ہیں جنکے نام ہیں الاقصیٰ ٹریولس اور ماڈرن ٹریولس۔یہ اطلاع بھی ملی کہ ایک شخص جو انکے ساتھ جانے والے تھے کسی وجہ سے نہیں پائے اور اسی کی جگہ پر مجھے ایڈجسٹ کردیا ہے اور اب میں 'ماڈرن' سے نہیں 'الاقصیٰ' سے جارہا ہوں۔میں اس شخص کو بھی زندگی بھر نہیں بھول سکتا جو خود غیر حاضر ہوکر میری حاضری کا انتظام کرگیا۔حالانکہ میرا نام لکھنے سے پہلے کارڈ پر پہلے سے لکھا ہوا نام کاٹا گیا تھا لیکن میں نے اپنی جبلت سے مجبور ہوکر اسے پڑھنے کی پوری کوشش کی اور وہ نام میرے خیال میں لیاقت علی ملک تھا۔اللہ ان کو (جن کے بارے میں میں نام کے علاوہ کچھ نہیں جانتا) بار بار حج بیت اللہ کی سعادت نصیب کرے۔ٹیکا لگ جانے کے بعد طے ہوا کہ میں ساڑھے چار بجے ٹریویل ایجنسی کے دفتر پہنچ جاؤں گا اور کاغذی کاروائی مکمل کرلوں گا۔

نفیس صاحب کا دفتر مرزا غالب اسٹریٹ میں ہے لیکن اسے آج بھی فری اسکول اسٹریٹ ہی کہتے ہیں۔وہاں پہنچتے ہی کام شروع ہوگیا لیکن چند دستخط کرنے کے علاوہ مجھے تو کچھ کرنا نہیں تھا۔ساری تفصیلات عارف عالم بھر رہے تھے۔میں نے اخیر میں چیک کاٹ کر حوالے کیا اور عتیق صاحب کو استفسارانہ نگاہوں سے دیکھا۔وہ اس دوران انٹرنیٹ پر کچھ کاروائی کر بھی چکے تھے، بڑے اطمینان سے بولے۔۔۔"آپ کی فلائٹ 10 نومبر کو ہوگی۔کل 37 دن کا سفر

ہے۔ واپسی 17 دسمبر کو ہو گی ،انشااللہ۔'' پھر کچھ پمفلٹ وغیرہ نکال کر دیے جن پر متعلقہ تفصیلات درج تھیں۔ معاملہ اتنا نارمل لگ رہا تھا کہ مجھے حیرت ظاہر کرنے کی ہمت بھی نہیں ہو رہی تھی ۔بالآخر یہ یقین کرنا پڑا کہ اس 30 ستمبر کو ایک تاریخی فیصلے کے دن (جب بابری مسجد کی دو تہائی زمین غیر متوقع طور پر دوفریقین کے حوالے کر دی گئی) میرے لیے عادل حقیقی کی عدالت سے ارض مقدس کی زیارت کا فیصلہ ہو گیا۔

کاغذات کے اسی لین دین کے دوران میں نے پوچھا ــــ'' جناب ایک بات دریافت کرنی تھی جس کا موقع شاید پھر نہ مل پائے ، وہ یہ کہ مجھے آپ کا ایک SMS موصول ہوا تھا۔اسی سے مجھے آپ کا نمبر حاصل ہوا۔لیکن میرا نمبر آپ کو کہاں سے دستیاب ہوا؟

عتیق صاحب نے ایک متشرع نوجوان کو آواز دی۔ چہرے سے لگا کہ بھائی ہیں ۔انہوں نے کہاــــ ''ہاں میں ابھی بتاتا ہوں۔''

کمپیوٹر میں کچھ تلاش کیا اور کہا کہ آپ کا نمبر رابطہ نام کی اس ڈائرکٹری سے لیا تھا جسے 'اخبارِ مشرق' نے شائع کیا تھا اور جس میں بنگال بہار اور جھارکھنڈ کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے اہم لوگوں کے نام، پتے اور ٹیلی فون نمبر دیئے گئے تھے۔اتفاق سے میرا نام بھی اس میں شامل تھا اور یہ بھی اتفاق ہے کہ اس دوران میرا نمبر بدلا نہیں اور یہی کام کر گیا۔

پورا دن جس مصروفیت اور حیرت میں گزرا۔اس کے بعد شام انتہائی پرسکون محسوس ہو رہی تھی ۔ یہ فکر بھی ہو رہی تھی کہ پتہ نہیں عدالت کا کیا فیصلہ آیا؟ کس کے حق میں آیا؟ کہاں کیا ردِعمل ہوا۔دن میں کولکاتا نسبتاً خاموش لگ رہا تھا۔اب اندازہ ہوا کہ مسلمانوں کی اکثریت والے علاقوں میں غیر مسلموں کی بیشتر دکانیں بند ہیں اوراسی طرح اس کے برعکس بھی ہے۔اس دوران جمشید پور سے ایک ہندی اخبار کے صحافی نے فون کر کے فیصلے پر ردِعمل پوچھا۔

میں نے اسی سے فیصلے کی جانکاری لی اور اپنا ردِعمل بتایا۔

رضوان جو دن بھر ساتھ ساتھ تھے اب ہاوڑا کے پاس واقع اپنے گھر لوٹ چکے تھے اور میں پارک سرکس کی طرف بڑھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ کیا 12 گھنٹوں میں حج کے سفر کی کاروائی پوری ہوسکتی ہے۔ کیا واقعی اس سال میرا جانا طے ہو چکا؟ بچپن سے یہی سنا ہے کہ کوئی صرف اپنی مرضی سے حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے 'بلاوا' آتا ہے، منظوری ہوتی ہے۔ میرے لیے تو اب بھی یقین کرنا مشکل تھا کہ اس بے عمل کا بھی بلاوا آ سکتا ہے؟

یاد آیا کہ جب حضرت ابراہیم ؑ نے خانہ کعبہ کی تعمیر کی تو اللہ نے حکم دیا کہ ابوقبیس کی پہاڑی پر چڑھ کر اعلان کردو ـــ اَذِّن من الناس بالحج تاکہ لوگ یہاں حج کرنے کے لیے آئیں۔ حضرت ابرہیم ؑ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہاں اس بے آب و گیاہ ریگستان میں لگائی ہوئی آواز کہاں تک پہنچے گی اور کون اسے سنے گا۔ اللہ نے بھروسہ دلایا ـــ اَذِّن و علی البلاغ تمہارا کام ہے صرف پکار دینا۔ یہ آواز نہ صرف دنیا میں موجود ہر شخص تک پہنچے گی بلکہ اس تک بھی آواز پہنچے گی جس نے ابھی دنیا میں قدم نہیں رکھا۔ چنانچہ یہ آواز عالم اجسام اور عالمِ ارواح تک پہنچی اور صرف وہ تمام مستعد ارواح جنہوں نے اس پر لبیک کہا ان کو حج کی سعادت قیامت تک نصیب ہوتی رہے گی۔ جس نے لبیک کہنے میں عجلت کی وہ جلد یہ سعادت حاصل کرے گا اور جس نے تاخیر کی وہ دیر سے کرے گا۔ یہ بات ذہن میں آئی تو اپنے ایک پرانے شعر کا نیا مفہوم خود اپنے اوپر کھلا:

بہت ضروری ہے اک روح وہ بھی تازہ دم ہوا سے، پانی سے پہلے، زمین سے پہلے

دل میں ایک عجیب سی خواہش پیدا ہوئی کہ شکریہ تو اپنی روح کا ادا کرنا چاہیے جو مستعد اور تازہ دم تھی۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ روح کا شکریہ کیسے ادا ہو؟ اور کون کرے؟

منزل کا حال رخت سفر بولنے لگا

میں نے اپنے طور پر کوشش کی کہ سفر حج کے اس ارادے اور پروگرام کی تفصیل مشتہر نہ ہو۔ صرف جن کو بتانا ضروری تھا ان کو بتایا، یا ان کو جن کی ناراضگی کا خطرہ تھا۔ لیکن ان لوگوں نے یہ تخصیص اور احتیاط باقی نہیں رکھی۔ لہٰذہ خاصے لوگوں کو رفتہ رفتہ خبر ہوتی چلی گئی۔ کئی آنکھوں سے تو اس طرح کے بیانات نشر ہوتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے— ''اچھا تو اب آپ بھی؟''— ''یہ تو حد ہوگئی''— ''نو سو چوہے کھا چکے تھے شاید'' — وغیرہ وغیرہ۔ ان کا ایسا سوچنا بے بنیاد بھی نہیں تھا۔ صوم کی پابندی تو تھی لیکن صلوٰۃ کی پابندی کبھی نہیں رہی۔ نماز کبھی پڑھ لی کبھی نہ پڑھی۔ ہاں مذہبی بحثوں میں حصہ لینا معمول میں شامل رہا۔ ایک بات ہمیشہ ذہن میں رہی کہ عقیدہ درست ہونا ضروری ہے عمل تو اللہ کی توفیق سے کبھی بھی درست ہو سکتا ہے۔ لیکن اب تھوڑی سی شرمندگی ضرور دامن گیر رہنے لگی کہ اس ارض مقدس میں تو نماز کی پابندی لازمی ہے اور یہ اچانک وہاں پہنچ کر ممکن نہیں۔ کوشش کی کہ یہ پابندی یہیں سے شروع ہو جائے۔ تھوڑی بہت کامیابی بھی ملی پھر بھی قضا ہونے کا سلسلہ جاری رہا۔

زیادہ تر لوگوں نے معلوم ہوتے ہی کھلے دل سے مبارکباد دی۔ اپنے لیے خصوصی دعا کرنے کو کہا اور دربارِ رسالت میں سلام عرض کرنے کی گزارش کی۔ وعدہ کرتا گیا لیکن دل میں یہ ڈر بھی لگا رہا کہ پتہ نہیں وہاں سب لوگ یاد آئیں گے یا نہیں۔ کسی کو بھول جاؤں تو وعدہ خلافی ہو گی۔ کئی لوگوں نے مشورہ دیا کہ ڈائری میں سب کے نام نوٹ کروں۔

اس بیچ میری تربیت کا سلسلہ جاری رہا۔ جو لوگ اس سعادت سے مشرف ہو چکے تھے

انہوں نے اپنے طور پر 'کیا کروں' اور 'کیا نہ کروں' بتانے میں کوتاہی نہ کی۔ بلکہ بقول شخصے سب نے اپنے اپنے انداز میں اور اپنے اپنے طور پر misguide کیا۔ کئی لوگوں نے تحریری تعاون دیا۔ کریم سٹی کالج کی گورننگ باڈی کے پریسڈنٹ عزیز صاحب نے بڑی محبت سے دو کتابچے لا کر دیئے۔ ایک انگریزی میں اور ایک اردو میں۔ کافی تفصیلی اور معیاری۔ ایک چھوٹا سا کتابچہ رضی نوشاد صاحب کا دستیاب ہوا، دلچسپ اور معلوماتی۔ کالج میں معاشیات کے استاد افتخار نبی صاحب نے ایک صفحے کا ایک ہدایت نامہ دیا۔ اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا۔ رضوان واسطی صاحب نے ایک صفحے کا ٹائپ کیا ہوا خاکہ دیا۔ جس میں مختصراً تمام باتیں درج تھیں۔ ایک سی ڈی بھی دی۔ اسلم بدر صاحب نے بھی وعدہ کیا تھا کہ وہ تفصیل سے ساری باتیں بتائیں گے لیکن وہ دہلی چلے گئے اور ملاقات نہیں ہوسکی۔ قدوس خاں صاحب نے اپنے تجربات بیان کیے۔

پٹنہ میں تو اتنا زیادہ مواد مل گیا کہ اس سے کنفیوزن اور بڑھ گیا۔ اکرام علی راشد اور کاظم ہاشمی صاحبان نے اپنے اپنے اعتبار سے Tips سے نوازا۔ برادرم شمیم منعمی کی گفتگو اس موضوع پر روز ہی ہوتی رہی اس سے بہت کچھ ذہن صاف ہوا۔ وہ خود بھی جا رہے تھے اور یہ امید بھی تھی شاید ایامِ حج میں ساتھ رہنے کا موقع مل جائے اور مزید فائدہ ہو۔ ایک پتلا سا کتابچہ حافظ فیضان احمد غفران احمد کی دکان سے بھی ملا جہاں سے برادرم فرد الحسن کے ساتھ جا کر احرام خریدا تھا۔ لیکن تمام دعائیں یاد رکھنی مشکل لگ رہی تھیں اور دیکھ کر پڑھنے کا موقع کس حد تک مل پائے گا، یہ بھی یقینی نہیں تھا۔ بالاخر ذہن نے فیصلہ کیا کہ وہیں چل کر دیکھا جائے گا۔ دعا تو اردو میں بھی مانگی جاسکتی ہے۔ اللہ کے لیے عربی کیا اور اردو کیا! ویسے بھی دل کی زبان زیادہ موثر ہے۔ یہ رابطہ بن گیا تو زبان کوئی مسئلہ ہی نہیں۔

اسی دوران حضرت شیخ احمد لنگر دریا بلخیؒ کے ملفوضات مونس القلوب کے اردو ترجمہ کا ٹائپ کیا ہوا مسودہ نظر نواز ہوا جو مولانا علی ارشد شرفی صاحب نے شمیم منعمی کے پاس مقدمہ لکھنے

کے لیے بھیجا تھا۔ ورق گردانی کرتے ہوئے ایک واقعے پر نگاہ ٹھہر گئی۔ حضرت مخدوم احمد لنگر دریا بلخیؒ نے لکھا ہے کہ بہار شریف کی جامع مسجد میں میں ایک دن مولانا نظام الدین تقریر کر رہے تھے اور مخدوم جہاںؒ بھی وہیں موجود تھے۔ مولانا نے تقریر کے دوران ایک رباعی پڑھی:

ای قوم بحج رفته کجائید کجائید   معشوق همیں جاست بیائید بیائید

آنانکه طلبگار خدائید خدائید   حاجت بطلب نیست شمائید شمائید

مخدوم جہاںؒ کو وجد طاری ہو گیا۔ گریہ کرنے لگے اور سر کو مسجد کے پائے پر پٹک پٹک کر زخمی کر لیا۔ بڑوں کی بڑی باتیں ہیں۔ انہوں نے اپنی نگاہ معرفت سے ان اشعار میں ایک جہانِ معنی دیکھ لیا ہوگا۔ لیکن اتنا ضرور ہوا کہ ذہن دیر تک ان اشعار کی گرفت میں رہا۔ بلاشبہ جس کی نگاہ اور دلِ مصفیٰ ہو گیا ہو اس کو خدا کی طلب میں بھٹکنے کی ضرورت نہیں۔ اگر کسی کو صرف اپنی حقیقت کا ادراک ہو جائے تو وہ حقیقت الٰہی سے بھی آگاہ ہو سکتا ہے۔ سچ ہے جس نے خود کو نہیں سمجھا خدا کو کیا سمجھے گا۔ اپنی ایک خاصی پرانی غزل کا شعر بے ساختہ زبان پر آ گیا:

خود کو پہچانتا نہیں ہوں میں

خود شناسی خدا شناسی ہے

معاملے تھے کرم کے سارے

اس دوران زیادہ وقت پٹنہ میں گزرا۔ ایک طرف اسمبلی الکشن کی گہما گہمی اور دوسری طرف بہار کے عازمین حج کی پٹنہ سے روانگی کا ہنگامہ۔ روزانہ اخبارات میں بڑی بڑی تصویریں اور بڑی بڑی خبریں، اور اس سے زیادہ بُری بُری افواہیں ـــــ اتنے لوگوں کا پاسپورٹ نہیں آیا ـــــ اتنے لوگ آج کی فلائٹ میں چھوٹ گئے ـــــ اتنے لوگ جدہ سے واپس بھیج دیئے گئے ـــــ جدہ پہنچنے والوں کا کوئی پرسانِ حال نہیں ـــــ عزیزیہ میں ٹھہرنے کی جگہ اب تک نہیں لی گئی ہے ـــــ جن کو خادم الحجاج کے طور پر جانا تھا وہ سب ابھی یہیں بیٹھے ہیں ـــــ وغیرہ وغیرہ۔

گھر سے میرے علاوہ اور تین لوگوں کو جانا تھا۔ پہلے خبر ملی کہ وہ 22 اکتوبر کو روانہ ہوں گے، آخری فلائٹ سے۔ پھر یہ تاریخ 23 ہوئی پھر 24 ہوگئی۔ پھر یہ بھی ٹل گئی۔ پھر 25 کو بھی جانا ممکن نہیں ہو سکا۔ بالآخر 26 اکتوبر کو مہورت نکلا اور شمیم منعمی، انکی اہلیہ اور بیٹا تینوں رخصت ہوئے۔ انکے روانہ ہوتے وقت گرچہ آنکھوں میں نمی تھی لیکن یہ اطمینان بھی تھا کہ جلد ہی میں بھی وہیں موجود ہوں گا اور امید قوی ہے کہ ملاقات کا سلسلہ بھی رہے گا۔ انشاءاللہ۔

اسی درمیان کولکاتا سے عارف عالم نے اطلاع دی کہ روانگی کی تاریخ 10 نومبر سے کھسکا کر 9 نومبر کر دی گئی ہے۔ اس وقت جب لوگوں کی تاریخیں آگے بڑھ رہی تھیں یہ ایک دن پیچھے کھسکنے کا نوید جانفزا ایک عجیب سرشاری کا باعث ہوا۔

پٹنہ کے حاجیوں کی روانگی کے پروگرام کی غیر یقینی صورتحال اور قسطوں میں ہو رہے الیکشن کی وجہ سے ایک ضروری کام میں تاخیر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ یعنی اپنے آبائی وطن جا کر سب

سے وداعی ملاقات۔اس میں مزید تاخیر کولکاتا سے آنے والے فون نے کر دی۔عارف عالم نے اطلاع دی کہ جو لوگ انکی معرفت حج میں جا رہے ہیں انہیں 30 اکتوبر کو کولکاتا کے سنٹرل ایونیو میں واقع دہلی کلب میں بلایا گیا ہے تا کہ کاغذات سپرد کر دیے جائیں اور ضروری ہدایات دے دی جائیں۔

میں ٹرین کی سست رفتاری کی وجہ سے قدرے تاخیر سے پہنچا، پھر بھی بہت سی ضروری باتیں سننے کو ملیں۔نفیس صاحب کافی تفصیل اور وضاحت سے سارے ارکان سمجھا رہے تھے۔جانے والوں سے صورت آشنائی بھی ہوئی۔پھر انہوں نے دسترخوان بچھایا۔مٹن بریانی، زردہ اور منٹھا (کولکاتا میں گھول) پیش کرنے کے بعد اطلاع دی ــــ ''دیکھ لیجیے جنہوں نے ابھی کا کھانا بنایا ہے وہی قاسم باورچی ہمارے ساتھ جا رہے ہیں اور پورے سفر میں یہی پکا کر کھلائیں گے۔'' بے ساختہ سراج اجملی اور کاظم ہاشمی یاد آ گئے جو ہر ملاقات یا گفتگو میں یہ ضرور کہتے رہے کہ ــــ

''کھانا بہت عمدہ کھلاتے ہیں یہ پرائیویٹ ٹور والے۔''

یہیں طارق سجاد مل گئے پروفیسر احمد سجاد کے بیٹے۔وہ رانچی کے انتہائی فعال لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔یہ بھی اردو میں کمپیوٹر سے متعلق مستقل لکھتے رہتے ہیں۔انہوں نے ہی پہچانا۔معلوم ہوا یہ بھی اسی ایجنسی کی معرفت جا رہے ہیں۔ان کی فلائٹ 7 نومبر کو ہے۔مجھ سے دو دن پہلے۔اپنی اپنی قسمت!

کولکاتا سے لوٹتے ہی 3 نومبر کو مظفر پور کے لیے نکلا۔گھنٹے بھر کی تگ و دو کے بعد بھی کسی بس میں بیٹھنے کی جگہ نہ ملی۔کچھ تو الیکشن کے بعد بھی تمام بسوں کے ریلیز نہ ہونے کی وجہ سے اور کچھ دیوالی میں گھر جانے والوں کی بھیڑ۔بالآخر ایک لوکل بس میں سوار ہوا تا کہ حاجی پور سے

ٹرین کی کوئی سبیل نکلے۔ ابھی بس کھلی بھی نہ تھی کہ لگا شاید مجھے اتنی دیر روک کر رکھا گیا تھا تا کہ اسی بس پر سوار ہو سکوں کیونکہ اس پر ہمدمِ دیرینہ محبوب اقبال سوار ہو رہے تھے۔ یہ بہار یونیورسٹی، مظفر پور کے شعبۂ اردو سے منسلک ہیں۔ میرے حج کے پروگرام سے واقف تھے۔ اسی سلسلے میں زیادہ گفتگو رہی۔ مظفر پور اسٹیشن تک ساتھ رہا۔ بس، رکشہ اور ٹرین کا کرایہ انہوں نے ہی دیا۔ ایسے بھی شاید وہی دیتے لیکن ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ آج کا یہ عمل کسی دوست کے لیے نہیں بلکہ ایک حاجی کے اکرام کے طور پر تھا۔

دو دن مظفر پور رہ کر سب سے ملا۔ دونوں چھوٹے بھائی، رشتہ دار اور گاؤں کے لوگ۔ نیک مشورے، نیک خواہشات اور نیک جذبات کے علاوہ ایک عزیز نے سعودیہ کا ایک سم کارڈ لا کر دیا۔ وہ ان دنوں میں چھٹی میں گھر آیا ہوا تھا۔ اس نے کہا — ”یہاں یہ سم کارڈ بیکار ہے، دو ماہ کی چھٹی کے بعد جب لوٹوں گا تب اس کی ضرورت پڑے گی اور اس سے قبل آپ لوٹ آئیں گے، انشاءاللہ۔ دونوں کا کام چل جائے گا۔“

اس سم کارڈ کے حاصل ہونے سے بہت خوشی ہوئی کہ اب جانے سے قبل خواہشمند لوگوں کو اپنا وہاں کا فون نمبر دے کر جا سکوں گا۔ ایک دن دل میں یہ خیال آیا ضرور تھا کہ کاش ایسا ہو پاتا، لیکن یہ خواہش بھی پوری ہو جائے گی اس کی توقع نہیں تھی۔ ایسا لگا کہ جس طرح گھر میں شریر بچے کی ہر خواہش فوراً پوری کی جاتی ہے تا کہ شور نہ کرے۔ اسی طرح میری چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی خیال رکھا جا رہا ہے۔

میرے مولیٰ بلا لو مدینے مجھے

پٹنہ سے 6 نومبر کو منھ اندھیرے روانہ ہو گیا۔ شام کی ٹرین سے ٹکٹ جان بوجھ کر نہیں بنوایا۔ خطرہ تھا کہ لوگ جلوس نکال دیں گے۔ پروفیسر مصطفیٰ سیماب، پروفیسر کاظم ہاشمی، ڈاکٹر اکبر علی، پروفیسر جاوید حیات اور خانقاہ منعمیہ کے متوسلین بار بار جانے کی تاریخ پوچھتے رہے اور میں گول مول جواب دے کر ٹالتا رہا۔ جس طرح کا الوداعی سلوک ان سے متوقع تھا میں خود کو اس کے لائق نہ پاتا تھا اور اس طرح رسمی طریقے سے رخصت ہونے کا تصور ہی میرے اندر انتہائی ندامت کا احساس پیدا کر دیتا تھا۔

پٹنہ سے کولکاتا کے راستے میں کئی لوگوں کے فون آئے۔ میرے اس طرح خاموشی سے نکل بھاگنے پر یقیناً ان کو مایوسی ہوئی ہوگی۔ غصہ بھی آیا ہوگا، لیکن اس کا اظہار کسی نے نہیں کیا۔

آسنسول نزدیک آ رہا تھا۔ یہاں دوستوں کا ایک خاصہ بڑا حلقہ ہے۔ موبائیل میں کئی نمبر محفوظ ہیں۔ کئی بار کوشش کے باوجود کسی سے رابطہ نہ ہو سکا۔ اسی جستجو میں وقیع منظر کا نمبر بھی آزمایا۔ یہ بھی آسنسول میں رہتے ہیں۔ خوش فکر شاعر اور بڑی محبت سے ملنے والے نوجوان۔ ہر اہم موقع پر ان کا SMS آتا رہتا ہے۔ حج کے سفر کی خبر ان کو بھی دے دی تھی۔ ان کا نمبر لگ گیا۔ رابطہ ہوتے ہی یہ جان کر کہ میں تھوڑی دیر بعد آسنسول سے گذروں گا، خوشی سے اچھل پڑے۔ منع کرنے کے باوجود اسٹیشن چلے آئے۔ وقت کم تھا پھر بھی کئی لوگوں کو خبر کر دی اور ایک صاحب کو اپنے ساتھ لیتے آئے۔ یہی نہیں اس تھوڑی سی مہلت کا بھی استعمال کیا اور پلیٹ فارم پر ملاقات ہوتے ہی کاغذ کا ایک پرزہ میرے ہاتھوں میں پکڑا دیا۔ میں سمجھا حسب معمول نام

وغیرہ لکھ کر دیا ہوگا کہ خاص مقامات پر دعا میں شامل رکھوں، لیکن دیکھا تو یہ اشعار لکھے تھے:

دیارِ پاک کا احمد سفر مبارک ہو　　کہ دیکھ پاؤ مدینہ نظر مبارک ہو

کھجور کی ہے نہ زم زم کی آرزو باقی　　سن آخری دلِ مضطر کی گفتگو باقی

در حبیب پہ میرا سلام کہہ دینا　　بنا لیں مجھ کو وہ اپنا غلام کہہ دینا

ان اشعار میں نہ علوئے فکر ہے نہ ندرت خیال نہ فنی اعتبار سے کوئی قابلِ ذکر پہلو ہے۔ یہ پانچ دس منٹ میں رواروی میں موزوں کیے ہوئے چند مصرعے ہیں لیکن یقین مانیے پڑھتے پڑھتے آنکھوں کی نمی کناروں سے باہر پھیل چکی تھی۔ یہ نمی بھی عجیب ہے جو بیک وقت آنکھوں کو گیلا کرتی ہے اور گلے کو خشک۔ تھوڑی دیر تک کوشش کے باوجود کچھ بولنے پر قدرت نہ رہی۔ سوائے وقیع منظر کو لپٹا لینے کے کچھ کہہ نہ سکا۔ اچھا ہوا ٹرین نے سیٹی دے دی۔ سیٹ پر واپس آکر بیٹھا تو یاد آیا کہ کئی بار نعت گوئی کے فن پر گفتگو کرتے ہوئے میں نے نعت میں عقیدت کے اکہرے اظہار کی مثال کے طور پر یہ مصرعہ دہرایا ہے:

میرے مولیٰ بلالو مدینے مجھے

لیکن گذشتہ ایک مہینہ کے عرصے میں جب بھی یہ مصرعہ سامنے آیا وقیع منظر کے اشعار جیسی ہی کیفیت پیدا کر گیا۔ شاید کسی کلام کی تاثیر پورے طور پر اسی ماحول میں کھلتی ہے جس میں وہ تخلیق ہوا ہے۔ کوئی شخص اس کیفیت کے جس قدر قریب ہوا ثر انگیزی میں اسی قدر اضافہ ہوتا ہے۔

نائن الیون

اہل مغرب پہلے مہینہ بتاتے ہیں پھر تاریخ، ہم اس کے برعکس کرتے ہیں۔ ان کے لیے ستمبر کی گیارہ تاریخ نائن الیون تھی۔ میرے لیے تو یہ 9 نومبر کا مبارک دن تھا۔ انکے نائن الیون میں دو جڑواں فلک بوس مینار زمین بوس ہوئے۔ میرے نائن الیون کی منزل وہ گھر تھا جہاں وہ تمام اصنام زمین بوس کر دیے گئے جن کی عقیدت لوگوں کے دلوں میں آسمان سے زیادہ بلند تھی۔

ایک دن قبل نفیس صاحب نے روپیوں کے عوض ریال دیتے ہوئے کہا تھا کہ کولکاتا سے ممبئی پہنچنے کے بعد وہاں سے جدہ کی فلائٹ میں دو گھنٹے کا وقفہ ہے۔ لوگ وہاں بھی احرام باندھ سکتے ہیں۔ لیکن میرا مشورہ ہے کہ یہیں سے باندھ کے چلیں تو اچھا ہے۔ وہاں صرف دو رکعت تحیۃ الاحرام پڑھ کے احرام کی نیت کرلیں گے۔ کبھی کبھی فلائٹ کو کسی وجہ سے پہنچنے میں تاخیر ہو جاتی ہے ایسے میں وقت کم ملتا ہے۔ میں نے ان کے مشورے پر عمل کیا۔ نہادھو کر احرام زیب تن کر لیا۔ بچپن سے لنگی پہننے کی عادت ہے اور جوانی سے ہی عموماً سفید تولیہ کندھے پر رہتی ہے اس لیے بظاہر تو کوئی خاص بات نہیں تھی لیکن اس کا جو باطنی پہلو ہے وہ رفتہ رفتہ وجود پر حاوی ہوتا جا رہا تھا۔

دس بجے جب نیچے آ کر ٹیکسی پر بیٹھا تو برادرم شمیم منعمی کے جملے یاد آ رہے تھے کہ احرام پوشی کا مطلب تمام علائقِ دنیوی سے تعلق توڑنا ہے۔ انسان اس کفن نما ملبوس میں اس مردے کے مانند ہوتا ہے جو قبر سے لے کر حشر تک کی منزلوں سے گذرتا ہے۔ میں نے کوشش کی تھی ایرپورٹ تک کوئی نہ جائے پھر بھی بھانجے عادل کو منع نہیں کر پایا۔ لیکن اجتماعی دعا کے بعد جب سارے

حجاج رفتہ رفتہ سیکیورٹی حلقے میں داخل ہو گئے تو شیشے کے باہر نم دیدہ اعزہ تھے اور حال چال جاننے کی کوشش کرتی ان کی آنکھیں۔ جو اندر آ چکے تھے وہ اب اپنی پریشانی سے رو برو تھے۔ جانچ، اسٹکر، بورڈنگ پاس، گیٹ نمبر، فلائٹ کا وقت بس یہی سب چیزیں تھیں، اور یہ فکر کہ دیکھیں آگے کیا معاملہ پیش آتا ہے۔ حالانکہ اس دن گفتگو ہو چکی تھی اس کے باوجود کم ہی لوگ احرام میں آئے تھے۔ لوگوں نے ممبئی کے دو گھنٹے کے وقفہ کو کافی سمجھا تھا اور اپنے اپنے اعتبار سے اس وقت کے مناسب ترین استعمال کے طریقے سوچ رکھے تھے۔

ائرپورٹ پر جو لوگ احرام میں تھے وہ تھوڑے مایوس تھے کہ اچھے بھلے سلے ہوئے لباس چھوڑ کر اس میں کیوں آئے، لیکن میں نے محسوس کیا کہ آس پاس کے ماحول پر اس لباس نے عجیب وغریب اثر ڈالا تھا۔ ہر شخص خواہ وہ کوئی مسافر ہو یا ایرپورٹ کا عملہ، یا ائرویز کا کارکن یا وہاں تعینات سی. آئی. اس. ایف. کا جوان سب کے برتاؤ میں ایک تجسس آمیز احترام شامل تھا۔ کئی لوگوں نے آکر کچھ بات چیت بھی کی اور تقریباً سب نے کہا کہ ہمارے لیے بھی دعا کیجیے گا۔

اسی دوران ایک شخص میرے لیے مرکز توجہ ہو چکے تھے۔ وہ ایک نوجوان سے محوِ گفتگو تھے۔ تھوڑی دیر میں اندازہ ہو گیا کہ آسام سے ہیں اور لیپ ٹاپ، انٹرنیٹ، ای میل وغیرہ کی تکرار سے میں نے اسمیا زبان نہیں سمجھنے کے باوجود یہ سمجھا کہ انہوں نے نوجوان کو یقین دہانی کی ہے کہ وہ جب چاہے اپنا میل چیک کر سکتا ہے۔ یہ تعلقات کو جوڑے رہنے کی خواہش ہمیشہ بے چین رکھتی ہے۔ تھوڑی دیر میں تعارف بھی ہو گیا۔ ان. آئی. لسکر، گواہاٹی سے نکلنے والے روزنامہ 'ایسٹرن کرونکل' کے ادارتی شعبے سے منسلک ہیں۔ میں نے اندازہ لگایا ضرور نورالاسلام ہوں گے۔ کم سخن، منکسر المزاج، فکر مند اور سمجھدار، دبی دبی سی لیکن متاثر کرنے والی شخصیت۔ بولے ـــــ

''میں دورانِ حج بھی رپورٹنگ کرتا رہوں گا۔''

وہ یہیں سے کام میں لگ گئے۔ لوگوں سے کچھ پوچھ رہے ہیں۔ نام وغیرہ نوٹ کر رہے ہیں۔ تصویریں لے رہے ہیں۔ اہلیہ ساتھ میں تھیں۔ وہ بھی مستعدی اور خاموشی سے مدد کر رہی تھیں۔

ظہر کی نماز ایرپورٹ پر ہی ہوئی، لاؤنج میں۔ اسی وقت معلوم ہوا کہ یہ جو ایک منحنی سے شخص ہمارے ساتھ ہیں، آسام کے کریم نگر کے ایک مدرسے میں مفتی ہیں۔ احرام میں تھے۔ نماز انھوں نے ہی پڑھائی۔ دو رکعت قصر۔ پھر نفیس صاحب کی تھوڑی سی گفتگو۔ راستے کی اور ممبئی پہنچنے کے بعد کی ہدایات۔ فلائٹ جیٹ ایرویز کی تھی۔ وقت ہو چکا تھا سب بڑھ چلے۔ اسی وقت اچانک کہیں سے ایک شخص برامد ہوا اور اسی فلائٹ پر سوار ہونے کے لیے بڑھنے لگا۔ لمبائی کی کمی چوڑائی سے پوری ہو گئی تھی۔ بڑے بڑے بال۔ آنکھوں پر گاگلس اور گلے میں کم از کم ایک کلو سونے کے ہار وغیرہ۔ فوراً یاد آیا کہ یہ تو فلمی موسیقار ہے، بپّی لاہری۔ وہ پوچھنے لگا——

''حج پر جا رہا ہے؟ ڈائرکٹ فلائٹ نہیں ہے؟ بومبے سے چینج کرنا ہوگا؟''

میں ہی نزدیک تھا، سر ہلا کر حامی بھری۔ اس نے پھر کہا—— ''بہوت بڑا گھر میں جا رہا ہے، بہوت پوتر جگہ میں جا رہا ہے۔ ہمارا لیے بھی دعا کیجیے گا۔''

میرے کچھ بولنے کی ضرورت نہیں تھی، تبھی میرے پیچھے والے شخص بولتے ہوئے لپکے —— ''بپی دا! ایک دم دعا کرے گا۔ آپ ہمارا دیس کا نام روشن کرتے ہیں، آپ کے لیے دعا کیسے نہیں کرے گا۔ میرا نام ... خان ہے۔ یاد رکھیے گا بپی دا۔''

بپی دا بھی کچھ بولتے ہوئے پلین میں جا کر بیٹھ گئے۔ ممبئی اترے تو یہی بپّی لہری لسکر صاحب کی گرفت میں تھے۔ انہوں نے اس سے کچھ پیغام بھی حاصل کیا اور تصویر بھی لی۔ میں نے دل میں کہا۔ ''ان کا آج کا ڈسپیچ تو تیار ہو گیا۔''

پہلا طبق روشن ہوا

جہاز میں مجھے کھڑکی کے پاس جگہ ملی تھی۔ میرے بازو والی سیٹ پر جو صاحب تھے وہ وضع قطع سے کسی مدرسے کے صدر مدرس اور عالم فاضل لگ رہے تھے۔ لیکن سچائی یہ ہے کہ آج کل آپ کسی کو اس کی ظاہری ہئیت سے نہیں پہچان سکتے۔ جیسے ہی جہاز ایک خاص اونچائی پر پہنچ کر ہموار طریقے سے اڑنے لگا اور سیٹ کی بیلٹ کھول لی گئی، میں نے کانوں میں موبائل کا ائیر فون لگا لیا اور ترجمے کے ساتھ قرآن سننے لگا۔ شیشے کے باہر بادلوں کا ایسا خوبصورت نظارہ تھا جو میں نے آج سے قبل کسی فلائٹ میں نہیں دیکھا تھا۔ کبھی لگتا کہ دھنی ہوئی روئی کی ایک یکساں پرت بچھی ہے اور کبھی لگتا کہ سمندر کے کنارے سوکھے ہوئے سفید نمک کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں پھیلی ہیں۔ میرے ہم جلیس بھی باہر جھانک رہے تھے۔ انھوں نے پوچھا۔۔۔

''ای کیا دکھائی دیتا ہے؟''

''بادل ہے''۔۔۔ میرا جواب مختصر تھا۔

''جہاز بادل کے 'اوپور' اڑ رہا ہے؟'' ۔۔۔دوسرا سوال۔

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ حیرت بھرے لہجے میں اگلا سوال ابھرا۔۔۔

''ای جو سات توبوک (طبق) آسمان بولتا ہے تو پہلا توبوک یہی ہے کیا ؟''

ان کی علمیت کا جو محل میں نے بغیر ان سے بات کیے تیار کر لیا تھا وہ ریت کا گھروندا ثابت ہوا۔ ہنسی بھی آئی۔ سوچا پوچھیں کہ صرف لاکھ ڈیڑھ لاکھ خرچ کر کے جیٹ ائرویز کی فلائٹ سے پہلے طبق آسمان کی سیر کرنا چاہتے ہیں؟ لیکن ڈر گیا کہ غصہ میں آ کر بنگلہ میں میرے ساتوں طبق نہ روشن

کر دیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ڈرائی کلیننگ اور ریڈی میڈ کپڑوں کا بزنس ہے اور یقیناً کامیاب ہے ورنہ حج کے اخراجات کے متحمل کیونکر ہوتے۔ تھوڑی دیر میں میں نے محسوس کیا کہ میرے کان میں لگے ایئر فون کو وہ تجسس، تشویش اور شبہہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن میرے مڑتے ہی ادھر ادھر دیکھنے لگتے ہیں۔ میں نے ایک کان کی ٹھیپی نکال کر ان کے کان میں لگادی۔ نیک آدمی تھے بہترین لہجے میں قران سن کر گدگد ہو گئے۔

جہاز وقت پر ممبئی پہنچا۔ سامان پر پہلے ہی انٹرنیشنل ٹرانسفر کا ٹیگ لگ چکا تھا اور سب پر ایک گروپ کا ٹیگ بھی تھا، اس لیے اطمینان تھا کہ وہ تو جہاز میں پہنچ ہی جائے گا۔ فکر خود کو سوار کرنے کی تھی۔ یہاں سے لائن لگنے کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ ایک لائن جو آپ کو اگلی لائن تک پہنچائے وہاں سے پھر اگلی لائن۔

پہلے ڈومیسٹک سے انٹرنیشنل ٹرمنل تک جانے کے لیے بس کی لائن۔ سب کے بورڈنگ کارڈ پہلے سے ہی نفیس صاحب کے پاس تھے۔ کولکاتا کی طرح انہوں نے یہ سب کو تقسیم کر دیے، ورنہ ٹکٹ لے کر لائن میں لگنا پڑتا تب بورڈنگ کارڈ ملتا۔ چلو ایک لائن کم ہوئی۔ کارڈ تقسیم کرتے کرتے انہوں نے بتادیا کہ احرام پہننے کے لیے کیا کیا کرنا ہے۔ یہ بھی کہ اب سب کو انفرادی طور پر تیار ہونا ہے اور فلائٹ تک پہنچنا ہے کیونکہ سب کا ایک ساتھ سارے مرحلوں سے گزرنا ممکن نہیں۔ بس ائرپورٹ کے اندر اندر انٹرنیشنل ٹرمینل روانہ ہوئی اس تو چھترپتی شیواجی ائرپورٹ کی وسعت کا اندازہ ہوا۔ بظاہر انٹرنیشنل ٹرمینل سامنے دکھائی دیتا تھا لیکن کم وبیش بیس منٹ کا وقت لگا کیونکہ اس کھلی جگہ میں بھی بس سیدھے سیدھے نہیں جاسکتی تھی۔ شہر کی پر پیچ گلیوں کی طرح مختلف راستوں سے گزرنے اور لاتعداد موڑ مڑنے کے بعد ہی پہنچ سکی۔

نفسی نفسی کا منظر سامنے تھا۔ کم وبیش تین سو لوگ وہاں کھڑے تھے جہاں حج والوں کا

امیگریشن ہورہا تھا۔ایک کارکن مستعد کھڑا تھا اور اس کی وجہ سے تمام لوگ اس زیڈ (z) نما پٹی کا حصار توڑنے میں بے بس تھے اور بے چینی سے اس کے ہٹائے جانے کا انتظار کررہے تھے۔وقت تیزی سے آگے کھسکتا جارہا تھا اور اے.بی.کی ٹھنڈک کے باوجود پسینے کی طرح کوئی غیر محسوس سی چیز وجود پر پھیلتی جارہی تھی۔زیادہ بے چینی ان کو تھی جنہیں احرام پوشی کے مرحلے سے گذرنا تھا۔ساتھ آنے والوں میں سے کئی کی نگاہیں مجھ جیسے احرام پوشوں پر رشک کے ساتھ پڑرہی تھیں۔ایک گھنٹہ گذر چکا تھا۔ائرپورٹ کا کارکن ایک وقت میں پانچ سات لوگوں کو ہی اندداخل ہونے دیتا تھا۔جس وقت وہ فیتہ ہٹاتا تو کسی کو کسی کی فکر نہیں رہتی۔صرف اپنا داخلہ پیش نظر ہوتا تھا۔شدید تناو کے باجود مسکراہٹ کی لکیر ہونٹوں پر پھیلی کہ دھیرے دھیرے حشر کا منظر سامنے آرہا ہے۔ذہن میں آیا کہ ابھی تو آدھے لوگ، جو اس بس میں نہیں سما سکے اور دوسری بس کے انتظار میں لائن میں کھڑے تھے،آئے بھی نہیں ہیں۔اسی وقت کارکن نے وہ فیتہ ہٹایا اور بولا۔۔۔

''پانچ چھ آدمی۔ایک ایک کرکے،آپ آیئے۔آپ لوگ انکو آنے دیجیے۔''

وہ ایک ضعیف اور اس کے ساتھ والے نوجوان کو ترجیح دے رہا تھا۔جب تک آٹھ دس گھس چکے تھے۔وہ ان کو روکنے بڑھا تو اس کے پیچھے سے راستہ بن گیا اور دیوار سے لگا ہوا میں بھی تمام اصول وضوابط بالائے طاق رکھ کر اندر آچکا تھا۔اس نے کسی طرح پھر سے بھیڑ کو قابو میں کیا اور اپنی جگہ پر ڈٹ گیا۔اندر آکر میں پھر ایک کاؤنٹر کے آگے لائن میں تھا۔خیر زیادہ وقت بھی نہیں لگا نہ اس شخص نے کوئی گفتگو کی۔بس ایک بار غور سے شکل دیکھی، پاسپورٹ دیکھا، بھرا ہوا فارم توجہ سے دیکھا، کچھ موازنہ کیا۔غالباً سامنے کمپیوٹر کا اسکرین تھا پھر مہر مار کر پاسپورٹ پکڑا دیا۔پھر سیکیوریٹی چیک میں داخل ہونے کی لائن، پھر چیکنگ کی لائن اور پھر اچانک ایک آزادی کا احساس۔مجھے محسوس ہوا کہ کہیں بھی غیر ضروری وقت نہیں لگا، نہ کسی نے کوئی بے تکا سوال کیا نہ کسی کے لہجے یا رویے میں کوئی روکھا پن تھا

۔لیکن وقت تو لگنا ہی تھا، سو لگا۔ اب ٹائلٹ کی تلاش شروع ہوئی۔ وہاں پہلے سے ہی پچاسوں لوگ جمع تھے۔ سب کو وضو کرنا تھا۔ اس سے قبل بہنوں کو حوائج ضروریہ سے فارغ ہونا تھا جسے وہ فلائٹ کے دوران ضبط کیے ہوئے تھے۔

واش بیسن میں وضو ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی میں نے بھی کیا ہے لیکن ٹانگ اٹھا کر اسے واش بیسن میں دھونا بڑی کراہیت کا باعث ہوتا ہے۔ میں عادت سے مجبور۔ ادھر ادھر تھوڑی تفتیش کی تو ایک کمرے کے باہر انگریزی میں VAZU لکھا دکھائی دے گیا۔ میں نے اس کا فائدہ اٹھایا۔ پھر کئی لوگ آ گئے۔ مجھ سے پہلے بھی لوگ آئے ہوں گے لیکن مجھے تو خالی ہی ملا۔ سب کو جلدی تھی بلکہ زیادہ تر کو مجھ سے زیادہ تھی۔ سب کو مغرب کی نماز پڑھنی تھی، احرام باندھنا تھا، تحیۃ الاحرام پڑھنی تھی۔ ان سب سے فارغ ہوتے ہواتے وقت دیکھا تو جہاز کی پرواز میں مشکل سے دس منٹ کا وقفہ تھا۔ بورڈنگ کارڈ پر گیٹ نمبر پانچ دیا ہوا تھا۔ لپکتا ہوا وہاں پہنچا۔ کہیں کوئی آثار نہیں۔ ہماری فلائٹ کا نام نمبر بھی کہیں ڈسپلے نہیں ہو رہا تھا۔ ایک خیال آیا کہ کہیں جہاز پرواز تو نہیں کر گیا پھر اسے جھٹک کر کاونٹر پر بیٹھے شخص سے دریافت کیا۔ اس نے کہا— ”13 نمبر گیٹ پر جایئے۔“

اندازہ ہوا کہ یا تو کولکاتا میں بورڈنگ کارڈ پر غلط نمبر پرنٹ ہو گیا تھا یا یہاں کسی وجہ سے بدل دیا گیا تھا۔ میں گیٹ نمبر 13 کی طرف دوڑا۔ بلا مبالغہ کم از کم آدھا کلو میٹر بھاگنا پڑا۔ راستے میں کئی جانی پہچانی صورتیں دکھائی دیں۔ یہ کولکاتا سے ساتھ آنے والے لوگ تھے۔ سب پریشان تھے۔ سب کو بلاتا ہوا 13 نمبر پہنچا اور ضروری کاروائی کے بعد جہاز میں داخل ہو کر اپنی سیٹ پر پہنچا۔ معلوم ہوا ابھی بہت سے لوگ نہیں آئے ہیں۔ آدھی سیٹیں خالی ہیں۔ جیٹ ائرویز کا عملہ ان کو تلاش کر کے لا رہا ہے۔ چالیس منٹ کی تاخیر سے جہاز روانہ ہوا۔ لیکن وقت سے دس منٹ قبل ہی جدہ پہنچ گیا۔

تو عرصۂ محشر میں ہے

جدہ کا نام حضرت بی بی حوا سے منسوب ہے۔کہا جاتا ہے کہ جنّت سے ان کو یہیں بھیجا گیا تھااور عرفات کے مقام پر حضرت آدمؑ سے انکی زمین پر پہلی ملاقات ہوئی تھی۔تھوڑی ہی دیر میں یہ تمام باتیں ذہن سے محو ہوگئیں اور جدہ کی وجہ تسمیہ میں جدو جہد کا عمل دخل زیادہ لگنے لگا۔ سب سوچ کر آئے تھے کہ وہ جلد سے جلد اپنے سامان کنویئر بیلٹ پر سے اٹھائیں گے اور اتنی ہی تیزی سے وہاں روانہ ہوں گے جہاں ٹھہرنا ہے،تا کہ فجر سے قبل تھوڑی سی نیند لی جا سکے۔نفیس صاحب بڑے اطمینان سے تھے۔حسب معمول مسکراتے ہوئے بولے۔ ''چلئے ابھی تو ٹرمنل میں بیٹھنا ہوگا۔دیکھئے یہ لوگ یہاں سے کتنے بجے چھوڑتے ہیں۔''

19 نمبر ٹرمنل میں ڈیڑھ دو سو لوگ پہلے سے بیٹے تھے۔ہم بھی وہیں ادھر ادھر پھیل گئے۔ہماری گھڑیوں میں ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔لیکن یہاں کے مطابق ابھی ساڑے آٹھ کا عمل تھا۔جو لوگ عشا کے وقت کو لے کر پریشان تھے ان کو قرار آیا۔یہیں دو رکعت قصر پڑھی گئی۔ پھر سب اپنی اپنی جانماز یا چٹائی بچھا کر بیٹھے اور کسی کسی نے لیٹنے کو ترجیح دی۔کرسیاں زیادہ تر بھری ہوئی تھیں اور خاصی ٹھنڈی تھیں۔میں نے موبائل کا سم بدلا۔دو تین لوگوں کو پہنچ جانے کی اطلاع دی۔جن کو نمبر دے کر آیا تھا ان میں سے کچھ کے فون بھی آئے۔

کم و بیش دو گھنٹے کے انتظار کے بعد معلوم ہوا کہ ہم سے قبل سومالیہ والے آئے ہوئے ہیں۔پہلے وہ جائیں گے پھر اپنی باری آئے گی۔سامنے شیشے کی وسیع و عریض دیوار تھی جس کے پار رنگ برنگ کے لوگوں کا ایک سیلاب وقفے وقفے سے گزرتا رہا۔پھر بالآخر ہمارے لیے بھی

دروازے کھول دیئے گئے۔ ابھی ہم باہر بڑے ہال میں پہنچے ہی تھے اور ہمارے پیچھے دروازہ بند ہوا ہی تھا کہ ٹرمینل کا دروازہ کھلا اور پھر ویسے ہی دو ڈھائی سو لوگ اس ہال میں داخل ہوئے جو ہم نے ابھی ابھی خالی کیا تھا۔ کسی نے کہا ترکی کے لگتے ہیں لسکر صاحب کا اندازہ تھا کہ روسی ہیں، آذربائیجان یا شاید ایسے ہی کسی علاقے کے۔ میں نے بھی سر ہلایا۔

اب پھر ایک لائن درپیش تھی۔ ہم کم وبیش آدھے گھنٹے تک لائن میں کھڑے رہے تا کہ ہم سے قبل والے ملک کے لوگ کاونٹر خالی کردیں اور ہم وہاں جا کر کاؤنٹر پر لائن لگا ئیں۔ پھر ایک سیاہ فام پھرتیلے نوجوان نے اپنے تجربے کا مظاہرہ شروع کیا۔ جس کاونٹر پر جگہ خالی ہوتی وہاں بڑی لائن سے چند لوگوں کو بھیج دیتا۔ عورتوں اور بوڑھوں پر خصوصی توجہ۔ خیر یہ مرحلہ بھی تمام ہوا۔ لوگوں کی انگلیوں کے نشانات لیے گئے۔ وہیں کیمرہ لگا تھا جس سے تصویریں لی گئیں۔ شاید آنکھ کی پتلیوں کی بھی تصویر لیں۔ یہ تھوڑا او باد ینے والا پروگرام تھا لیکن بہت اہم۔ یہاں کی بے توجہی سے کوئی غلط کاغذات کے ساتھ ملک میں داخل ہوسکتا ہے۔ میرے ساتھ پتہ نہیں کیوں خصوصی سلوک ہوا۔ نہ انگلیوں کے نشانات لیے نہ تصویر۔ کچھ دریافت کیا جس کا مفہوم عربی نہ سمجھنے کے باوجود میں نے یہی سمجھا کہ — ''پہلی بار آئے ہو؟''

میں نے اقرار میں گردن ہلائی اور اس نے آگے بڑھ جانے کا اشارہ کرتے ہوئے پاسپورٹ پکڑا دیا۔ اس پر وہ اتنی دیر میں کئی جگہ مہریں مار چکا تھا۔

اب سامنے ایک گھیرے میں سامان کا ڈھیر تھا۔ میں نے اپنا اکیلا ٹرالی بیگ قبضے میں لیا۔ سوچا سارے مرحلے تمام ہو چکے اب چل کر کرسی پر بیٹھا جائے۔ دیکھا تو نفیس صاحب حسب معمول بڑے اطمینان سے اپنے ساتھ لائے ہوئے سامان کے بڑے بڑے 22-20 بنڈل ٹرالی پر بار کر اور کرا رہے تھے۔ ان میں چاول سے لیکر مصالحہ جات اور بسکٹ سے لے کر ہلدی رام کا

بھجیا تک سب کچھ موجود تھا۔ مسکرا کر بولے ـــــ

''پہلے سامنے والے خیمے میں جایئے وہاں بھی پاسپورٹ پر ایک اسٹکر چپکایا جائے گا۔ اس سے قبل سامان کی چیکنگ ہوگی۔''

دل بیٹھنے لگا کیونکہ اب تک ان چکروں میں یہاں کے مطابق بھی بارہ بج چکے تھے اور تاریخ بدل چکی تھی۔

سامان ایکسرے مشین سے گذارا گیا۔ ڈر تھا کہ کہیں کھولنا نہ پڑے۔ ڈر اس کا نہیں کہ کچھ برآمد ہوگا بلکہ یہ کہ بیگ میں بڑی محنت سے سامان کو ترتیب سے رکھا گیا ہے۔ بے ترتیب ہونے سے پیکنگ میں مزید آدھا گھنٹے لگ جائے گا۔ ہاں یہ بھی پریشانی تھی کہ اس میں احرام کے اضافی سِٹ کے علاوہ بھی سفید کپڑے کے دو پیکٹ تھے۔ یہ دراصل رضوان کریمی کی مہربانی تھی۔ وہ خود بھی حج میں آئے ہوئے تھے اور انہوں نے فون کر کے مجھ سے پہلے ایک کفن کا کپڑا لانے کو کہا پھر جب میں لے چکا تو دوسرے کی فرمائش کردی۔ اس سے وزن بھی بڑھا اور ذمہ داری بھی۔ یہ وسوسہ بھی دل میں تھا کہ اس پر سامنے والے کو کیسے سمجھاؤں گا۔ کہیں یہ سننے کے بعد، کہ لوگ زمزم سے دھلے ہوئے کفن میں دفن ہونے کو باعثِ برکت ونجات سمجھتے ہیں، وہ شرک بدعت نہ کرنے لگے۔ ایک وسوسہ اور تھا شمیم منعمی فرمائش کر چکے تھے کہ سادہ چائے بنانے کے لیے پتی اور اس میں ڈالنے کو کالا نمک لیتے آیئے گا۔ یہ بھی بتا چکے تھے کہ پچھلی بار کالے نمک سے سکیوریٹی والا کافی پریشان تھا اور چکھ کر دیکھنے کے بعد ہی اس نے پیچھا چھوڑا۔

یہ وسوسے یونہی رہ گئے اور میں بڑی آسانی سے باہر آ گیا۔ شاید اس لیے کہ اس وقت وہاں دو بیگ کھلے ہوئے تھے جن کا سامان الٹا پلٹا جا رہا تھا۔ جب میں نے اپنا بیگ اٹھایا اور باہر جانے کے لیے اشارے سے پوچھا تو اس نے مجھ پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ شاید دیکھا بھی نہیں

کیونکہ اس وقت اس کے ہاتھ میں پالی تھین کی دو چھوٹی چھوٹی تھیلیاں تھیں جن میں موجود سیاہی مائل شے کو وہ ٹٹول کر دیکھ رہا تھا اور صاحب سامان اس کو بڑی مشکل سے بنگلہ آمیز اردو میں ــــ ''سورتی'' ــــ ''کھینی'' ــــ ''تمباکو'' ــــ ''کھانے کے بعد کھانے کا ہے،'' وغیرہ سمجھا رہا تھا۔ معاملہ دلچسپ اور قابل دخل اندازی تھا لیکن نفیس صاحب نے ایک عربی مقولہ سنایا تھا جس کا مفہوم تھا کہ سعودی کچھ سوچتا سمجھتا نہیں۔ کہیں وہ اس کو چھوڑ کر میرے پیچھے نہ پڑ جائے۔ یہ محشر کی گھڑی تھی اور ہر شخص اپنا اپنا حساب کتاب دے رہا تھا۔

جان بچی تو... کہتا ہوا جب میں پھر اگلے خیمے تک جا رہا تھا جہاں معلم کا اسٹکر پاسپورٹ پر لگنا تھا تو بے ساختہ پٹنہ کے حج ہاؤس کا وہ واقعہ یاد آ رہا تھا جو انتہائی ثقہ راوی نے بیان کیا تھا۔

اس سال حج پر جانے والوں کا تیسرا چوتھا دن تھا۔ اجتماعی دعا ہو چکی تھی اور بیشتر حاجی ائرپورٹ روانہ ہو چکے تھے۔ اسی دوران ایک شور اٹھا۔ ایک ضعیف شخص پھولوں کے ہار پہنے اور گلے میں شناختی کارڈ لٹکائے لوگوں کے نرغے میں تھے۔ لوگ بار بار انہیں کچھ سمجھاتے اور ان کا ایک ہی جواب ہوتا ــــ ''ہم نہیں جائیں گے۔ ہمرا پیسہ واپس کر دو۔''

انہیں سمجھا بجھا کر ذمہ داران کے پاس لے جایا گیا۔ وہاں بھی ان کا ایک ہی جواب ــــ ''ہمرا جی کیسا کیسا کر رہا ہے۔ ہم نہیں جائیں گے۔ ہمرا پیسہ واپس کرو۔''

ان کو سمجھایا گیا سارا پیسہ تو جمع ہو گیا، ٹکٹ کٹ گیا، ٹھہرنے کی جگہ لے لی گئی، اب واپس کہاں سے ہوگا۔ وہ اور بھڑکتے اور پھر وہی جملہ دہراتے۔ بالآخر ایک سمجھدار شخص نے معاملہ اپنے ہاتھ میں لیا۔ سب کو ڈانٹ کر چپ کرایا۔ ان کو بڑی محبت سے کرسی پر بٹھایا۔ تعارف حاصل کیا۔ معلوم ہوا کہ شمال مشرقی بہار کے ایک گاؤں سے تعلق ہے۔ کھیتی باری کرتے ہیں۔ بچے باہر کے ملکوں میں کام کرتے ہیں، وہی ان کو حج پر بھیج رہے ہیں۔ پوچھا گیا ــــ

''کھیتی کے علاوہ کیا کرتے ہیں؟''

کہا۔۔۔''اور کچھ نہیں کرتے ہیں۔'' پھر دوبارہ سوچ کر بتایا۔۔۔''نعت پڑھتے ہیں۔'' فوراً فرمائش کی گئی۔ ان کا موڈ قدرے بحال ہوا۔ ایک نعت شریف سنائی۔ پھر فرمائش ہوئی۔ ایک اور سنائی۔ اب نرمی سے پوچھا گیا کہ کیوں نہیں جانا چاہتے؟ بگڑ کر بولے۔۔۔

''میرا بیڑی کا سب بنڈل اور ماچس بیگ میں رکھوا دیا۔ بولتا ہے جدہ میں ملے گا۔ ہمرا جی کیسا کیسا کر رہا ہے۔ ہم نہیں جائیں گے۔''

معاملہ صاف ہو گیا۔ فوراً ایک آدمی دوڑایا گیا جب تک ان سے گفتگو بھی ہوتی رہی۔ اس شخص نے لوٹ کر کہا کہ ''بیڑی نہیں ملی۔'' لوگوں نے سر پیٹ لیا۔ ''ارے عقل کے دشمن سگریٹ ہی لے آتے۔'' سگریٹ کا پیکٹ آیا۔ انہوں نے ایک سگریٹ پی۔ پھر دوسری پی۔ لوگ خاموشی سے دیکھتے رہے۔ پھر ڈرتے ڈرتے پوچھا گیا۔۔۔

''اب تو جایئے گا نہ؟'' اب بشاشت لوٹ چکی تھی۔ مسکرا کر بولے۔۔۔

''ہاں، جائیں گے۔'' سب نے چین کی سانس لی۔

نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن

سب کو اپنا اپنا سامان مل چکا تھا اور پاسپورٹ پر آخری مہر اور اسٹکر کے سب مراحل تمام ہو چکے تھے۔ ہم اب ایک نسبتاً بڑے احاطے میں ہانک دیے گئے۔ سامنے تھوڑی دوری پر گیٹ بنے تھے۔ انڈیا، پاکستان، بنگلہ دیش، سری لنکا وغیرہ۔ معلوم ہوا یہیں سے گذر کر باہر نکلنا ہے پھر ایک بس قیام گاہ تک لے جائے گی۔ ایک ملک کا آدمی دوسرے ملک کے گیٹ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ بظاہر کوئی پولس، کوئی پہرا نہیں لیکن آپ نے ذرا سا اپنی حد سے باہر قدم بڑھایا کہ عربی لباس پہنے ادھر ادھر آتے جاتے لوگوں میں کسی نے تنبیہ کی۔ تجربہ کار لوگوں نے سمجھایا۔ کہیں مت جایئے۔ یہیں کرسیوں اور بنچوں پر بیٹھیے یا کچھ بچھا کر سو جایئے۔ جب یقینی ہو جائے کہ بس آ گئی تبھی باہر نکل سکتے ہیں۔ یہ ایک طرح کی قید بے مشقت تھی۔ ساری رات یونہی جاگتے اونگھتے گذر گئی۔

اسی احاطے میں نماز پڑھنے کی جگہ ٹائلٹ، وضو خانہ، کھانے پینے کی چیزوں کی دکانیں سب تھیں۔ اس دوران کئی قافلے آنکھوں کے سامنے سے گذرے لیکن اپنا نمبر نہیں آیا۔ سارا سامان بڑی بڑی ٹرالیوں پر بار کر کے رکھا تھا۔ لوگ تھکے ہوئے تھے لیکن آس پاس کا معائنہ بھی باریکی سے کر رہے تھے۔ دیکھنے لائق تو بہت چیزیں تھیں خاص کر وہ عمارت جہاں آنے والے حجاج کرام ساری کاغذی کارروائیوں سے گذر رہے تھے۔

یہ فن تعمیر کے اعتبار سے ایک نادر جگہ تھی۔ بڑے اور اونچے گول آہنی ستون جن کو دو تین لوگ مل کر ہاتھوں کا گھیرا بنائیں تب پکڑ میں آئیں۔ ان سے نکلتی آہنی رسیاں اور ان سے کھنچے

ہوئے سفید خیمے، چھتری نما اور درمیان میں گول سی خالی جگہ جس سے آسمان دکھائی دے۔ تھوڑا اور باریکی سے دیکھا تو سمجھ میں آیا کہ یہ سیکڑوں کی تعداد میں تنے ہوئے اور دوسرے سے جڑے ہوئے ترپال نما کپڑے کے ویسے خیمے نہیں جیسے سرکس میں نصب کیے جاتے ہیں بلکہ یہ تو اسی ساخت میں بنی ہوئی مستقل عمارتیں ہیں۔ لسکر صاحب نے فرمایا ـــــ

''میں نے انٹرنیٹ پر ایک دن دیکھا تھا۔ یہ Tent City خاص حج کے لیے بنایا گیا ہے۔'' پھر وہ اس کی تفصیلات بتانے لگے۔

صبح جب ہم یہاں سے نکل رہے تھے تو اجالا پھیل رہا تھا اور اس روشنی میں یہ اندازہ ہوا کہ یہ سیمنٹ بھی نہیں ہے فائبر گلاس جیسی چیز ہے جو خاصی دبیز ہے پھر بھی سورج کی روشنی اس سے پوری طرح نہیں رکتی اور خاصہ اجالا رہتا ہے۔

اس دوران دو بار لائن لگے اور دونوں بار معلوم ہوا کہ نہیں ابھی ہماری بس نہیں آئی۔ ایک بار تو سب اسی احاطے کی مسجد میں جا کر بیٹھ چکے تھے اور فجر کی اذان میں زیادہ وقت نہیں تھا تب نفیس صاحب آئے اور برہمی سے بولے ـــــ

''کیا کریں بھئی ابھی بلا رہا ہے۔ چلیے، نماز راستے میں کہیں بھی پڑھ لیں گے۔''

سب بادل ناخواستہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ جب لائن لگ گئی اور اسی عالم میں اذان بھی ہوگئی تو ایک ذمہ دار سے لگنے والے نوجوان نے عربی میں کچھ کہا جو کچھ انداز سے اور کچھ اس کے ہاتھ کے اشارے سے سمجھ میں آیا کہ پہلے جا کر مسجد میں نماز پڑھ لو تب چلیں گے۔ اب نفیس صاحب اڑ گئے کہ کہیں نہیں جائیں گے، یہیں پر نماز پڑھیں گے اور پھر یہیں کھڑے رہیں گے۔ وہی ہوا۔ اتنی دیر میں بلا مبالغہ بیس بار ہماری گنتی ہوئی۔ کئی بار ایسا محسوس ہوا کہ ان کے پاس جو فہرست ہے اس سے موازنہ کرنے پر حاضرین کی تعداد میں فرق پڑ رہا ہے۔ دراصل کچھ لوگ

رات بھر جاگنے اور مستقل تھکاوٹ کی وجہ سے لائن میں کھڑے نہیں تھے، کہیں آس پاس ہی بیٹھے تھے۔ ہر تھوڑی دیر پر کوئی نہ کوئی پانی پینے یا استنجہ سے فارغ ہونے چلا جاتا تھا۔ تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ بالآخر کسی طرح گھنٹہ بھر بعد ان کو اطمنان ہوا۔ مجھے تو شبہ ہے کہ چونکہ بس کے آنے میں تاخیر تھی اس لیے وہ سب کو اسی طرح مصروف کیے ہوئے تھے۔ بیچ بیچ میں نفیس صاحب نعرہ لگاتے۔ لبیك اللهم لبيك اور پھر ایک ماحول بننے لگتا جو ہر چیز پر حاوی ہو جاتا۔

پاکستان اور ہندوستان کے لیے ایک ہی راستہ تھا۔ دونوں کے آفس بھی متصل تھے۔ لیکن ہندوستانی آفس میں نسبتاً سناٹا تھا۔ بلکہ سچ کہوں تو میں نے زیادہ تر ایک ہی شخص کو بھاگ دوڑ کرتے دیکھا جس کے لباس کے پیچھے ترنگا بنا ہوا تھا اور INDIA لکھا ہوا تھا۔ پوچھنے پر بے چارگی سے بولا ـــــ

''چار ہزار آدمی روز آتے ہیں اور اکیلا آدمی، دیکھ لیجیے۔''

وہ شخص چلنے میں لنگڑا بھی رہا تھا۔ معلوم ہوا کسی کا ٹرنک پاؤں پر گر گیا تھا۔ پھر بھی اس نے ہمارے لیے بھی کافی دوڑ دھوپ کی۔ اللہ اس کو بہترین اجر دے، امین!

کُلُّ حَاجِی ! کُلُّ حَاجِی !

ہمارے لیے دو بسیں آئی تھیں ۔ بعد از خرابی بسیار دوسری بس میں جگہ مل پائی ۔ پہلی بس ایک گھنٹہ قبل روانہ ہوئی ۔ ہم بس میں بیٹھے اس کے کھلنے کا انتظار کرتے رہے ۔ صبح سات بجے بس نے جدہ ائرپورٹ چھوڑا ۔ سنا تھا کہ ڈیڑھ سو کلو میٹر کی رفتار سے بسیں چلتی ہیں اور انتہائی آرام دہ ہوتی ہیں ۔ لیکن ہمیں تو ایسا کچھ محسوس نہیں ہوا ۔ عام بسیں تھیں اور معمولی رفتار سے چل رہی تھیں، بلکہ دھیمی تھیں ۔ ائر کنڈیشنڈ تو بہر حال تھیں کہ یہ وہاں کی مجبوری ہے ۔

تقریباً دس بجے بس معلم کی رہائش گاہ پر پہنچی ۔ عتیق صاحب وہاں موجود تھے ۔ انہیں دیکھ کر خوشی ہوئی ۔ وہ سات تاریخ والے گروپ کے ساتھ آئے تھے ۔ تھوڑی دیر بعد یہاں سے بس آگے بڑھی اور بالآخر مکہ کے محلّہ العزیزیہ میں شارع عبد الله خیاط پر المستشفیٰ علوی تونسی کے سامنے کی سڑک کے قریب ایک مکان کے پاس آکر رکی ۔

تقریباً سوا دس بجے تھے ۔ کمروں کی تقسیم ہوئی ۔ دوسری منزل پر ایک کمرہ ملا، کل پانچ لوگوں کے لیے ۔ یہ رہائشی کمرے ہیں، ٹائلس لگے ہوئے، ائر کنڈیشنڈ، جن کا سامان سمیٹ کر رکھ دیا گیا ہے اور عارضی طور پر بیڈ لگا دیے گئے ہیں ۔ حج کے اس اژدہام میں جب کہ اسی عمارت میں ایک سو ستر لوگ ٹھہرے ہیں، اس سے زیادہ عیش کی توقع نہیں کی جاسکتی ۔ معلوم ہوا جو بس پہلے چلی تھی ۔ وہ ابھی نہیں پہنچی ہے ۔ اس بس پر ہمارے ساتھیوں کے علاوہ خاصی تعداد میں ممبئی سے آنے ہوئے حاجی بھی تھے ۔ شاید بس پہلے ان کی قیام گاہ پر گئی ہو ۔ فکر یہ تھی کہ ہمارا سامان اسی کی چھت پر تھا ۔ خیر اللہ مالک ہے ۔

طارق سجاد یہاں پہلے سے موجود تھے۔ان سے معلوم ہوا کہ وہ لوگ ممبئی سے ہی چار گھنٹے کی تاخیر سے چلے تھے۔اور یہاں تک پہنچنے میں انہیں دن کے ڈھائی بج گئے تھے۔گنتی کے حساب سے سب کے لیے لنچ کا پیکٹ معلم کی رہائش گاہ سے ساتھ آیا تھا وہ مل گیا۔پہلے اسی سے انصاف کیا گیا پھر کمر سیدھی کرنے کی تیاری تھی تب تک سامان بھی آ گیا،صحیح سلامت۔ظہر کی نماز کے لیے مسجد دریافت کی گئی۔ایک صاحب نے اشارے سے سمت بنادی۔مسجد نزدیک ہی تھی۔ پہنچے تو دیکھا مسجد کعب بن مالک۔حضرت کعب ؓ جید صحابی تھے۔

نماز سے لوٹنے کے بعد کسی نے بتایا کہ مشورہ ہوا ہے سارے لوگ آج آرام کریں اور کل صبح عمرہ کے لیے جائیں۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگا کہ اتنا قریب پہنچ کر ایک دن انتظار کیا جائے۔میں نے اپنے ارادے کا اظہار کیا۔تین چار لوگ اور تیار تھے، پھر آٹھ دس ہو گئے۔عتیق صاحب رہنمائی کو تیار ہوئے اور سب کو لے کر چلے۔

کوئی سواری دستیاب نہیں تھی۔ٹیکسیاں خالی نہیں تھیں۔ہر تھوڑی دور پر سیکڑوں لوگ سڑک پر کھڑے آتی جاتی گاڑیوں کو حسرت سے نہ صرف دیکھ رہے تھے بلکہ ہاتھ ہلا ہلا کر رکنے کی گزارش کر رہے تھے۔لیکن عتیق صاحب تجربہ کار آدمی ہیں سب کو لیے تھوڑا آگے بڑھے تو ایک جگہ تین چار بڑی بڑی عمارتوں کے بیچ کئی بسیں کھڑی تھیں۔خوبصورت، بڑی اور آرام دہ۔معلوم ہوا یہ انتظام ایرانی حاجیوں کے لیے ہے۔اگلے کئی دنوں کے مشاہدے میں بھی یہی آیا گویا ہر منٹ ایک بس ایرانیوں کے لیے کھلتی تھی۔پتہ نہیں یہ انتظام مقامی حکومت کی طرف سے ہوتا ہے یا ایرانیوں نے اپنے طور پر یہ نظم کیا ہے لیکن ہے حیرت انگیز اور شاندار۔ہم بھی انہیں بسوں میں سے ایک میں گھسے۔بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کسی نے کچھ کہا تو نہیں لیکن ڈرائیور کے چہرے پر ناگواری کے آثار تھے،اس نے کچھ کہا بھی لیکن عتیق بھائی کا نعرہ گونجا۔۔۔۔ کُلَّ حاجی! کُلَّ حاجی!

کوئی کچھ نہ بولا۔بس نے ایک جگہ لے جا کر سب کو اتار دیا۔معلوم ہوا کہ یہ جگہ ہے محبس جن ۔کسی نے بتایا۔یہیں پاس میں مسجد جن ہے جہاں سورۃ جن کا نزول ہوا تھا۔دوسرے شخص کی اطلاع تھی یہاں پر بہت سے جنوں نے حضور ﷺ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا۔ایک اور جانکاری ملی کہ یہیں کہیں بہت سے شریر جنوں کو قید کر کے رکھا گیا ہے۔محبس کہتے ہی ہیں قید خانے کو۔واللّٰہُ اَعلَم ۔مستند روایت یہ ہے کہ مسجد جن کی پشت پر ایک غیر آباد مسجد ہے جسے مسجد جندراوی یا مسجد سلیمانی بھی کہتے ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں حضرت سلیمان علیہ السلام نے کچھ جنوں کو قید کیا تھا۔

یہاں سے حرم کے لیے مخصوص بسیں دس دس سکنڈ پر جا رہی تھیں ۔دوسری بسیں یہاں سے آگے نہیں جا سکتیں ۔اس مخصوص بس نے لے جا کر جہاں اتارا وہاں سے وہ گوشہ سامنے تھا جہاں پر کبھی صفا کی پہاڑی تھی اور جہاں سے سعی کی شروعات ہوتی ہے۔

ہم سب ساتھ ساتھ آگے بڑھے۔بس سے اترتے ہی یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ ہم ایک زبردست مجمع کا حصہ بننے والے ہیں۔ساتھیوں میں سے ایک شخص کا یہ دوسرا حج تھا۔میری خواہش تھی کہ اسی کے ساتھ ساتھ رہوں تاکہ سہولت ہو۔لیکن یہ سب باتیں تبھی تک تھیں جب تک مسجد حرام کی طرف بڑھ رہے تھے۔داخلہ کے دروازے تک پہنچتے پہنچتے کون کدھر گیا، کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔سب کے سب آدمیوں کے سیلاب میں ادھر ادھر بہ گئے۔تھوڑی سی گھبراہٹ ہوئی لیکن اشتیاق خود اعتمادی کی شہ پا کر قوی ہو چکا تھا۔اطمینان کے ساتھ اندر داخل ہوا۔جو کچھ پڑھا سنا تھا سب ذہن میں تھا۔نگاہیں نیچی کیے آگے بڑھتا رہا۔پھر آٹھ دس سیڑھیاں اتر کر ایک صحن میں پہنچا تو یقین ہو گیا کہ میں مطاف میں کھڑا ہوں کیونکہ نیچی نگاہ سے بھی طواف کرتے لوگوں کے پاؤں دکھائی دے رہے تھے۔نگاہ اٹھائی تو خانۂ کعبہ سامنے تھا۔پھر اچانک سب کچھ ذہن سے نکل گیا۔نہ یہ یاد رہا کہ کیا دعا پڑھنی ہے۔نہ یہ پڑھا ہوا یاد رہا کہ تین قدم ہٹ کر کیا پڑھنا

ہے۔صرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا یاد رہا ــــ یا یہ سمجھیے کہ یہ ایک فطری عمل تھا جو خود بخود ہو گیا۔

دھیرے دھیرے یہ یاد آیا کہ خانۂ کعبہ پر پہلی نگاہ پڑتے ہی جو پہلی دعا مانگی جاتی ہے ضرور قبول ہوتی ہے۔تب تک آنسوؤں سے چہرہ بھیگ چکا تھا اور آواز رندھ چکی تھی۔آگے پیچھے، دائیں، بائیں ہر طرف سے صرف گڑگڑانے، کلپنے اور بلکنے کی صدا تھی۔اس وقت نہ اپنے لیے کچھ مانگنا سوجھا نہ حضرت امام ابوحنیفہؒ سے منسوب اس دعا کی طرف ذہن گیا کہ 'یا اللہ مجھے مستجاب الدعوٰت کر دے۔' صرف یہ منھ سے نکلا کہ ــــ ''یا اللہ لوگوں نے مجھ سے یہاں جو بھی دعائیں کرنے کو کہا ہے وہ سب پوری کر دے۔'' اس دعا سے ایک سکون سا محسوس ہوا اور ساتھ ہی ساتھ دل میں یہ بات بھی چلتی رہی کہ اپنے لیے کیا مانگنا۔مانگتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔جس نے ہمیشہ مجھے میری صلاحیت، اہلیت، لیاقت، محنت، طلب اور توقع سے زیادہ دیا، اس سے کیا مانگوں؟

انہی خیالات کے ساتھ ساتھ میں طواف کرنے والوں کے دھارے میں بہ چکا تھا آدھے چکر کے بعد جیسے ذہن کو جھٹکا سا لگا کہ بغیر نیت کے طواف شروع کر چکا ہوں اور حجر اسود کے سامنے سے شروع بھی نہیں کیا۔پھر یہ بھی خیال آیا کہ یہ میں عمرہ کا طواف کر رہا ہوں یا محض طوافِ زیارت۔میرے چاروں طرف دیوانہ وار دوڑنے اور با آواز اور بے آواز دعائیں مانگنے والوں کا ایک بڑا ہجوم تھا۔حجر اسود والا پہلو یعنی رکن یمانی قریب آ رہا تھا اور اس کے سامنے لگی سبز ٹیوب لائٹ سامنے دکھائی دینے لگی تھی۔چند لمحوں میں فیصلہ کیا کہ ابھی صرف طوافِ زیارت کرتا ہوں۔کل جب سارے لوگ آئیں گے تو ساتھ آ کر طواف عمرہ اور سعی وغیرہ کر کے احرام کھولوں گا۔اسی فیصلے کے ساتھ میں وہاں حجر اسود کی سیدھ میں پہنچ چکا تھا۔

زیادہ تر لوگ دو چار لمحوں کے لیے ہی سہی یہاں رکنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں تاکہ حجر اسود کو بوسہ نہ بھی دے پائیں تو کم از کم استلام کر سکیں، یعنی دور سے ہی سلام کر کے ہاتھوں کو چوم

لیں۔اسی وقفے میں میں نے نیت کی، استلام کیا اور اب باضابطہ پہلا چکر شروع ہوا۔

میں نے پڑھا تھا کہ ادب کے تقاضے کے طور پر طواف کرتے ہوئے خانۂ کعبہ پر نظر نہیں ڈالنی چاہیے۔آنکھیں نیچی رہیں، صرف حجر اسود کے سامنے پہنچ کر ہی نظر اٹھا کر دیکھنا چاہیے اور پھر نگاہیں نیچی۔اسی کوشش میں مصروف تھا۔ چاروں طرف ایک ایسی عجیب وغریب سرشاری اور وارفتگی کا ماحول تھا کہ کوئی اس سے اچھوتا رہ نہیں سکتا۔ دوسرے چکر کے دوران بغیر اوپر دیکھے یہ احساس ہو گیا کہ میں خانۂ کعبہ کے کافی پاس آچکا ہوں۔ ہری بتی دیکھ کر حجر اسود کے سامنے رکا تو دیکھا کہ چھو تو نہیں سکتا لیکن زیادہ دور بھی نہیں ہوں۔

لوگ وہاں پر پروانوں کی طرح چپکے ہوئے تھے رکن یمانی سے ہی لوگ دیوار سے چپکے ہوئے انچ انچ کر کے حجر اسود کی طرف بڑھتے ہیں تا کہ اس کو زندگی میں ایک بار مس کرنے کا شرف حاصل کر سکیں۔خیال آیا کہ میں بھی کوئی کمزور نہیں ایک بار گھس کر کوشش کرنی چاہئے پھر ہمت جواب دے گئی۔شاید اس لیے بھی کہ بغیر دوسرے کو دھکا دیے ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ وہاں جو بھی پہنچا وہ بغیر کسی کو دبائے یا ہٹائے نہیں پہنچا ہوگا۔ایسی کوشش کرنا مجھے گوارا نہیں ہوا، اور جب تک طواف کرنے والوں کی بھیڑ مجھے لے کر آگے بڑھ چکی تھی۔بھیگی آنکھوں کے ساتھ نظر اٹھائی تو یقین نہیں آیا۔مقام ابراہیم کے بالکل سامنے تھا۔ چھوا، چوما تھوڑی دیر سٹے رہنے کی کوشش کی پھر خیال آیا کہ طواف میں ہوں تو آگے بڑھ گیا۔تیسرے چکر میں بھی مقام ابراہیم کے بہت پاس سے گذرا حطیم کی دیوار کو چھوتا ہوا مڑا اور پتہ نہیں کیسے ایسا لگا کہ تھوڑی سی کوشش کر لوں تو دیوار کعبہ چھو سکتا ہوں۔ میں بھیڑ میں کھسکتا ہوا دیوار تک پہنچا۔چھو کر پتھروں کے کھردرے پن کو محسوس کیا اور ان کے درمیان جو دھات کی پٹی ان کو جوڑتی ہے (اور شاید سونے کی ہے) اس کی چکناہٹ محسوس کی۔

دو تین میٹر اس کو چھوتا ہوا بڑھا پھر دوری بڑھتی گئی۔ چوتھا چکر پورا ہونے سے قبل ہی حطیم کے پاس صف میں بیٹھ جانا پڑا کیوں کہ عصر کی اذان ہونے والی تھی اور وہاں تعینات وردی پوش سب کو صلوٰۃ صلوٰۃ کہ کر بٹھا رہے تھے۔

اذان اور نماز کے بعد بقیہ چکر پورے کیے پھر صفا اور مروہ کی طرف جا کر دیکھا۔ ادھر بھی زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ سوچا کہ اگر طواف عمرہ کی نیت کی ہوتی تو ابھی سعی بھی کر لیتا۔ پھر سر منڈا کر عمرہ مکمل ہو جاتا، احرام اتار کر عام لباس میں آ جاتا۔ پھر خیال آیا کہ شاید ایک دن اور اسی حالت میں رکھنا منظور ہے تاکہ دماغ میں بیٹھے ہوئے بت رفتہ رفتہ ٹوٹتے جائیں:

— ذات کا بت

— خاندان کا بت

— علمیت کا بت

— منصب کا بت

— شہرت کا بت

— اور بھی پتہ نہیں کتنے اور کیسے کیسے خیالی بت۔

بھولے بھٹکے بھی راہ پاتے ہیں

طواف کے بعد اسکلیٹر سے اوپری منزل تک چلا گیا۔ یہاں کے درمیانی خلا سے نیچے صفا اور مروہ کے بیچ دوڑتے لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ سب ایک جیسے۔ کسی کو پتہ نہیں کہ اس کے قدم سے قدم ملا کر چلنے والا یہ کون ہے۔ اس وقت سب کی حیثیت برابر ہے۔ سب کا منصب برابر ہے۔ سب کی پہچان ایک ہے۔ ایک نظر اپنے حلیے پر ڈالی تو چہرے پر بے ساختہ ایک مسکراہٹ سی پھیل گئی۔ کبھی کبھی کسی فقیر یا سادھو کو ایسے ہی لباس میں دیکھا ہے یا بودھ بھکشوؤں کو جو گہرے گیروے یا میرون رنگ کے اسی طرح کے لباس میں ہوتے ہیں۔ ان کے لباس کا کچھ حصہ گو سلا ہوا ہوتا ہے لیکن دونوں میں کافی مشابہت ہے۔ یہاں اس وقت میرے جیسے ننگے سر اور ننگے پیر فقیر لاکھوں کی تعداد میں موجود تھے اور ان کے درمیان اپنی حیثیت کا خوب خوب اندازہ ہو رہا تھا۔

اسی وقت یہ احساس بھی ذہن پر دستک دینے لگا کہ اپنے گروپ سے بچھڑ چکا ہوں۔ واپس لوٹنے کی کیا صورت ہوگی۔ مغرب سے پہلے نکل چلنا مناسب ہوگا۔ رات ہونے پر شاید دقت زیادہ ہو۔ یاد آیا کہ ایک ساتھی گلریز نے بتایا تھا کہ مسجد حرام کے باب السلام کی طرف سے باہر نکلنے پر سامنے والی سفید عمارت، جس میں اب لائبریری بنا دی گئی ہے، حضور ﷺ کی جائے پیدائش ہے۔ اسی کی بغل سے ایک راستہ اوپر سڑک تک جاتا ہے، وہیں سے ٹیکسی ملے گی۔ لیکن یہ اضافہ بھی کر دیا تھا کہ ایک دو گھنٹے انتظار بھی کرنا پڑ سکتا ہے۔ اس بات نے ذرا سا تردد پیدا کر دیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ جدھر سے آیا ہوں ادھر سے ہی لوٹ کر دیکھتا ہوں۔ اسی وقت زمزم

کے نل دکھائی دے گئے۔ کاغذی گلاس سے تین چار گلاس زمزم پیا۔ یاد آیا کہ زم زم پیتے وقت کی گئی دعا بھی قبول ہوتی ہے۔ جو دعا پہلے کی تھی وہی دہرائی۔ پھر اس میں اتنا اضافہ کیا ــــ ''یا اللہ! لوگوں نے میرے بارے میں جو دعائیں کی ہیں ان کو بھی قبول کر لے'' اتنی ذہانت بھری دعا کر کے چہرے پر خوشگوار طمانیت پھیل گئی۔

اسی طرف سے باہر نکلا جدھر سے داخل ہوا تھا۔ اسی طرح بس سے مجسس جن واپس لوٹا۔ یہاں سے اسی طرح سیکڑوں بسیں واپس لوٹ رہی تھیں جیسے آئی تھیں۔ لیکن یقین مانیے گھنٹے بھر کی کڑی محنت کے بعد بھی میں کسی بس میں گھسنے میں ناکام رہا۔ ڈرائیور اور اس کا معاون پہلے ہی پوچھتا ــــ ایرانی؟ ــــ ترکی؟ ــــ اندونیسی؟ ــــ عراقی؟ . . .

ہندی یا انڈیا سننے کے بعد وہ نگاہیں پھیر لیتا۔ ہر ملک کی بسوں کے کھڑے ہونے کی مخصوص جگہ تھی جہاں ان کے جھنڈے بنے تھے۔ بینر لگے تھے۔ وہ صرف اپنے اپنے ملک والوں کو بس پر جگہ دے رہے تھے اور مسلسل روانہ کر رہے تھے۔ میں نے پوری کوشش کی لیکن ہندوستان والوں کے لیے کوئی بس دکھائی نہیں دی۔ ایک ستون پر ترنگا جھنڈا ضرور بنا تھا اور 'بھارت INDIA' لکھا تھا۔ بس!

آخر طے کیا کہ پیدل ہی بڑھتا ہوں۔ اندازے سے اسی طرف رخ کیا جدھر سے آیا تھا۔ دو تین ٹیکسی والوں سے بھی 'اپنی' عربی میں بات کی، منزل کا پتہ بتایا۔ پچاس ریال اور تیس ریال کی مانگ ہوئی۔ میں نے سن رکھا تھا کہ زیادہ بتاتے ہیں مگر دس ریال میں پہنچا دیتے ہیں اس لیے آگے بڑھ گیا۔ اپنے آپ کو کسی مشکل صورتحال میں ڈالنا پھر اس سے نکلنے کی سبیل سوچنا میرا پرانا شغل ہے۔ پھر یہ اطمینان تھا کہ زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا؟ تیس یا پچاس ریال دے دیں گے، تب تک ان علاقوں کو دیکھ لوں پھر پتہ نہیں موقع ملے یا نہیں۔ تقریباً دو کلومیٹر چل چکا تھا اسی

دوران مغرب کا وقت ہو گیا۔ اذان کی آواز چاروں طرف سے آنے لگی۔ اندازہ کیا کہ مسجد کدھر ہے۔ اس وقت میں ایک پل بلکہ فلائی اوور کے نیچے سے گذر رہا تھا جسے جدید عربی میں کوبری (بروزن مرغی) کہتے ہیں۔ اس سے متصل ایک چھوٹا سا پارک تھا۔ بہت صاف ستھرا نہیں تھا، اور اس وقت جب شہر کی آبادی راتوں رات لاکھوں میں بڑھ رہی ہوایسا ہونا ممکن بھی نہیں تھا۔ اسی پارک میں دیکھتے دیکھتے چار چھ جگہ چھوٹی چھوٹی جماعتیں کھڑی ہو گئیں۔ اور میرے سنبھلتے سنبھلتے نماز ہو بھی چکی۔

یہاں لوگ نماز ترک نہیں کرتے لیکن اس میں زیادہ وقت بھی نہیں دیتے۔ مصلّے پر کھڑے ہوتے ہوتے نیت باندھ لی۔ ہاتھوں کو پوری طرح کان تک اٹھانے کا جھمیلا بھی نہیں۔ ہم لوگ جتنی دیر میں ثنا پڑھتے ہیں اتنی دیر میں یہ سورۂ فاتحہ اور کوئی دوسری سورۃ بھی مکمل کر لیتے ہیں۔ رکوع سجود بھی بڑی تیزی سے انجام پاتے ہیں۔ سلام پھیرتے ہی کھڑے ہو گئے۔ نہ دعا، نہ سنت، نہ نفل۔ مساجد میں یہ صورتحال نہیں۔ قرأت بہت اطمینان سے ہوتی ہے اور اچھی لگتی ہے۔ کوئی امام تکبیر تحریمہ اور سورۃ فاتحہ کے بیچ خاموشی کا ایک طویل وقفہ رکھتے ہیں تو کوئی سورۂ فاتحہ اور دوسری سورۃ کے بیچ۔ سمع الله لمن حمده کہ کر سجدہ میں جانے سے قبل تو کبھی کبھی اتنا طویل وقفہ ہوتا ہے کہ ہم جیسا آدمی گھبرا جاتا ہے۔ کوئی تو دو سجدوں کے بیچ بھی خاصہ طویل وقفہ دیتے ہیں۔ لیکن دعا کوئی نہیں مانگتا سوائے باہر سے آئے لوگوں کے۔

میں قریب کی ایک ختم ہوتی ہوئی جماعت کی طرف بڑھا لیکن چپل اتارتے اتارتے وہ سلام پھیر چکا تھا۔ اس دوران کئی لوگ ادھر ادھر سے آکر شامل ہوتے گئے تھے۔ شروع میں چھ سات لوگوں کے لائق ایک پلاسٹک کی چٹائی اور آگے کپڑے کا ایک پتلا جا نماز تھا۔ آنے والوں نے ادھر ادھر سے پھیلے ہوئے گتے اور پیکنگ والے ڈبوں کے ٹکڑے جوڑے اور صف لمبی ہوتی

گئی۔سلام پھیرتے ہی صف منتشر ہوگئی لیکن آٹھ دس لوگ اور جمع ہو چکے تھے۔دوسری جماعت بلا تاخیر شروع ہوگئی میں اسی میں شامل تھا۔

نماز کے بعد میرا پیدل سفر جاری رہا۔راستے میں ٹیکسی والوں سے دریافت کرتا رہا۔دو ایک ٹیکسیاں خود آ کر رکیں۔میں نے عشرہ ریال کی رٹ نہیں چھوڑی۔دراصل مجھے بھٹکنے میں مزہ آرہا تھا۔

ہر موڑ پر ایک نیا منظر، ایک نیا تجربہ۔چاروں طرف احرام پوش یا احرام اتار کر سر منڈا چکے لوگوں کی چہل پہل اور ہر طرف پھیلا ہوا ایک بازار۔انواع واقسام کی چیزیں۔کفار مکہ کو یہی ڈر تھا کہ اسلام کا غلبہ ہوتے ہی مکہ سے بت پرستی ختم ہو جائے گی اور تمام قبیلے، جو اپنے اپنے بتوں کی پوجا کے لیے ہر سال یہاں آتے ہیں، آنا بند کر دیں گے اور یہاں کا بازار اجڑ جائے گا۔ اللہ انہیں تھوڑی دیر کی مہلت دے دے اور وہ آکر آج کے مکہ کی مرکزیت اور یہاں کے بازار کی وسعت دیکھ لیں تو یقیناً اپنی ناعاقبت اندیشی پر ماتم کریں۔

یونہی گذرتے ہوئے ایک نسبتاً پرسکون سڑک پر ایک ٹیکسی ڈرائیور نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔میں نے پتہ بتایا عزیزیہ جنوبیہ ، شارع عبد اللہ خیاط ، المستشفیٰ علوی تونسی اور کوشش کی کہ الفاظ عربی مخرج سے ادا ہوں۔وہ اپنی سیٹ پر بیٹھا برگر حلق سے نیچے اتار رہا تھا اور اس کے ہاتھ کے پاس ہی کافی کا کپ رکھا ہوا تھا۔اس نے میرے لہجے کا قطعی رعب نہیں کھایا اور منہ چلاتے ہوئے بولا—''بیس ریال۔''

پہلے تو ایک جھٹکا لگا پھر میں نے لہجے کا اندازہ کیا اور پوچھا —''پاکستانی؟''

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔میں نے پھر پوچھا—''پنجاب؟''

اس نے پھر سر ہلایا۔میں نے کہا—''دس ریال''

وہ بے تعلقی سے کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھتا رہا۔ میں نے بھی قدم آگے بڑھائے تبھی پیچھے سے آواز آئی ـــــ ''سنو!''

میں نے رک کر پیچھے دیکھا۔ اس نے آنے کا اشارہ کیا۔ میں نزدیک آیا تو اس نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر ہی بیٹھ گیا۔ اس نے برگر ختم کیا۔ کافی کا گھونٹ بھرا۔ پھر ایک موبائل کا واؤچر نکالا۔ اس کو کھرچ کر اس کا نمبر برآمد کیا، موبائل کو ریچارج کیا، ایک نمبر ڈائل کیا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

آدھے راستے تک ٹھیٹھ قسم کی پنجابی میں جو گفتگو ہوئی اس کا خلاصہ یہ ہے کہ رابطہ ہوتے ہی اس نے اپنی اہلیہ کو ایک جھاڑ پلائی کہ آج میرے موبائل سے کس نے فون کیا تھا؟ کس سے بات کی تھی؟ خبردار بغیر میرے بتائے ایسا کبھی نہ کرنا۔ مجھے ضروری بات کرنی تھی اور اس میں پیسے ہی نہیں تھے۔ اس میں پیسے ڈالنے پڑے ہیں۔ میں سوچتا رہا کہ اگر اسی قسم کی گفتگو چلتی رہی تو تھوڑی دیر بعد شاید اسے پھر نیا واؤچر لینا پڑے۔ اچھی بات یہ تھی کہ مجھے بالکل صحیح جگہ پر اتارا۔ دس ریال لیے اور خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک قافلے کے ساتھ

نومبر کی گیارہ تاریخ، ناشتے کے بعد نفیس صاحب سب کو لے کر حرم شریف روانہ ہوئے۔ہم نے پھر ایرانی انتظام کا سہارا لیا اور اسی طرح حرم پہنچے۔صبح نو بجے کا وقت ہونے کے باوجود بھیڑ خاصی تھی۔ ہر دن یہاں کی آبادی لاکھ میں بڑھ رہی تھی اور سب کو یہاں آنا ہی ہے اس لیے یہ فطری بھی ہے۔ ہمارے ساتھ کے زیادہ تر لوگ پہلی بار خانۂ کعبہ کے سامنے تھے۔ان کی گریہ وزاری نے ایک عجیب سماں باندھ دیا۔نفیس صاحب جماعتی ہیں۔ اس لیے ان کے مزاج میں رقت بہت زیادہ ہے۔ ذرا سی تحریک پر آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہیں اور زبان ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔اس کا اثر آس پاس بھی بڑی تیزی سے ہوتا ہے۔انہوں نے بڑی مہارت اور تجربہ کاری سے ایک ایک بات کی طرف توجہ دلائی: اب ایسا کیجیے— یہ کرنا سنت ہے— یہ مستحب ہے— یہ پڑھیے— لیکن سب سے اچھی بات جو وہ اکثر کہتے رہتے ہیں وہ یہ کہ اگر آپ کو دعا ٹھیک سے یاد ہے اور آپ اس کا مفہوم سمجھتے ہیں تبھی پڑھیے ورنہ اپنی زبان میں اللہ سے عرض کیجیے۔واقعی وہ ہر ایک کی زبان کیا دل کے جذبات بھی سمجھتا ہے۔صرف کچھ کلمات ،مثلاً حجر اسود کے سامنے جو پڑھنا ہے یا رکن یمانی سے حجر اسود کے درمیان جو پڑھنا ہے وہ دعائیں عربی میں پڑھیے۔ یہ آسان بھی ہیں اور سب کو یاد بھی رہتی ہیں۔

نفیس صاحب نے تاکید کی تھی کہ سب لوگ ساتھ ساتھ رہنے کی کوشش کیجیے، ہو سکے تو ایک دوسرے کو پکڑ کر چلیے۔ یہ ترتیب تقریباً دو چکروں تک تو کم وبیش قائم رہی پھر کون کہاں گیا کچھ پتہ نہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دوسرے چکر میں مجھے رمل کی وجہ یاد آ رہی تھی۔ صلح حدیبیہ کے بعد اگلے سال جب حضور ﷺ اپنے تمام رفقاء کے ساتھ حج میں آئے تو ایک کثیر مجمع آپ کے ساتھ تھا۔ کفار مکہ نے پوری کوشش کی تھی کہ معاہدہ نہ ہونے پائے۔ اسی لیے انہوں نے اس کی شرطیں بہت سخت بلکہ بظاہر توہین آمیز رکھی تھیں لیکن اللہ نے اس شر میں خیر کا پہلو پیدا کر دیا۔ اب جبکہ ان کے یہ ازلی دشمن ان کے سامنے حج کے ارکان ادا کر رہے تھے اور وہ انہیں کچھ کہہ نہیں پا رہے تھے تو اپنی عقل کی ناکامی پر انتہائی خجالت کے شکار تھے۔ یہ خجالت اتنی بڑھی کہ انہوں نے بیت اللہ کے آس پاس کا علاقہ چھوڑ دیا اور پاس کی پہاڑیوں میں جا کر چھپ گئے۔ حضور ﷺ جانتے تھے کہ وہ کہاں چھپے بیٹھے ہیں اسی لیے حکم دیا کہ تن کر اور اکڑ کر چلو تا کہ وہ جو پہاڑیوں میں چھپے جھانک جھانک ہمیں دیکھ رہے ہیں ہمیں مسرور و مطمئن دیکھ کر تلملا جائیں۔ پتہ نہیں کیوں مجھے جب بھی یہ واقعہ یاد آتا ہے تو علامہ واقف سے سنا ہوا یہ شعر بھی یاد آتا ہے جو ان کے مطابق مولانا آزاد کے والد ہمیشہ پڑھا کرتے تھے:

چھیڑنا شیطاں کا عادت کیجیے

یا رسول اللہ کی کثرت کیجیے

اس وقت طواف کے دوران میرے دل میں آیا کہ چلا کر کہوں ـــــ

"کہاں ہے اے ابوجہل، ابولہب، عتبہ، شیبہ، ولید! نکل اپنی اپنی چھپنے کی جگہوں سے اور دیکھ کہ آج لاکھوں سر اسی کی بندگی میں یہاں جھکے ہوئے ہیں جس کا نام لینے پر تم نے حضرت سمیہؓ کو شہید کیا۔ حضرت بلالؓ کو گرم ریت پر لٹا کر ان کے سینے پر پتھر رکھ دیا۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کو اتنا پیٹا کہ اپنی دانست میں انکا کام تمام کر دیا اور کس کس کے ساتھ کیا کیا نہیں کیا۔ دیکھ کہ آج ان تین سو ساٹھ بتوں کے نام بھی کسی کو

یادنہیں اور ایک اللہ کے نام سے ساری فضا گونج رہی ہے۔ ہر منٹ ہزاروں ہزار آرہے ہیں اور ابھی کئی دن آتے رہیں گے۔ نکل اپنی جگہ سے اور دیکھ 8 ذی الحجہ سے منیٰ عرفات اور مزدلفہ میں بلالؓ کے غلاموں کا مجمع۔ نکل اور دیکھ کہ وہ جو تجھے بہکاتا تھا اس کے نام پر اتنے کنکر مارے جاتے ہیں کہ انہیں ٹرک سے ہٹانا پڑتا ہے اور جہاں پتھر مارنے والوں کے لیے کئی منزلہ پل تعمیر کیے گئے ہیں۔ نکل اور دیکھ کہ ابولہب کا مکان اب بیت الخلا میں تبدیل ہو چکا ہے اور وہ جو حضور ﷺ کو ابتر کہتے تھے آج ان کا نام لیوا پوری دنیا میں کوئی نہیں۔''

میں نے احرام سے پونچھ کر آنکھیں خشک کیں اور نگاہ ذرا سی اوپر اٹھائی تو دو جانب سے پہاڑیوں کی جگہ فلک بوس عمارتیں ہی دکھیں۔ انہیں میں سے ایک وہ عمارت بھی ہے جس پر دنیا کی سب سے بڑی گھڑی نصب کی گئی ہے، جو مشہور زمانہ بگ بین گھڑی سے تین گنا بڑی ہے اور جس کے منٹ کے کانٹے کی لمبائی ستر فٹ سے زیادہ ہے۔ دل میں دو باتیں ساتھ ساتھ ابھریں۔ پہلی یہ کہ آج کفار مکہ میں سے کوئی آئے تو وہ رمل کرنے والوں کے بجائے یہ عمارتیں ہی دیکھتا رہ جائے گا، اور دوسری یہ کہ کاش یہ گھڑی کسی مسلم ملک میں بنائی گئی ہوتی! سنا ہے جدہ سے مکہ معظمہ اور مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تک کی مجوزہ سپر فاسٹ ٹرین کا ٹھیکا بھی کسی چینی کمپنی کو ہی ملا ہے۔

ان خیالات کو ذہن سے جھٹکا اور دائیں بائیں کا اندازہ کیا تو نہ نفیس صاحب دکھائی دیے نہ ہی کوئی شناسا چہرہ۔ ذرا سی تشویش ہوئی پھر گردوپیش کا ماحول اپنی پوری اثر انگیزی کے ساتھ حاوی ہوتا چلا گیا۔ میں نے کل شام بھی محسوس کیا اور آج کی کھلی دھوپ میں واضح طور پر مشاہدہ کیا کہ بیشتر ممالک سے آئے ہوئے لوگ جس ترتیب، تنظیم اور سلیقے کا مظاہرہ کرتے ہیں اس کا عشرِ عشیر بھی ہمارے اندر نہیں پایا جاتا۔

میں تھوڑی دیر تنزانیہ کے ایک گروپ کے ساتھ چلتا رہا جس میں ایک شخص ہاتھ میں ایک دعا کی کتاب لیے وقفہ دے دے کر زور زور سے دعائیں پڑھتا تھا اور اس کے ساتھ کے تیس چالیس لوگ ان کو دہراتے جاتے تھے۔ ترکی والوں کا بھی ایسا ہی دستہ تھا جس کے افراد کبھی عربی اور کبھی ترکی میں دعائیں پڑھتے۔ انڈونیشیا والوں نے بھی یہی طریقہ اپنایا تھا اور اتنی بھیڑ اور مجمع کے باوجود بڑی آسانی سے اپنا طواف کر رہے تھے۔ ایسے ہی بہت سے افریقی اور ایشیائی ممالک کے قافلے، اور سب کے ساتھ تھوڑی تھوڑی دیر میں بھی اسی کا حصہ ہو کر چلتا رہا۔ لیکن جب میں ایک ایرانی دستے کے قریب آیا تو اس کے اثر سے دیر تک خود کو آزاد نہیں کر پایا۔

تقریباً بارہ صحتمند لوگوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر ایک گول دائرہ سا بنا لیا تھا۔ اس دائرے میں آٹھ دس عورتیں تھیں بالکل محفوظ و مامون۔ نپے تلے قدم رکھتا ہوا یہ مصروفِ طواف دستہ میری طرح کتنوں کا مرکز توجہ تھا۔ انہیں میں سے ایک صحتمند ایرانی جس رقیق القلبی سے باواز بلند دعائیں پڑھتا تھا اس سے یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی اپنے حواس میں رہ سکے۔ پہلے خود ان کا گھیرا اور ان کو گھیرے میں لیے ہوئے لوگوں کا ایک بڑا گھیرا جس طرح ان دعاؤں کو دہراتا تھا اس سے لگتا تھا یہ دعائیں زبان سے نہیں دل کی گہرائیوں سے نکل رہی ہیں۔ تقریباً پون چکر ان کے ساتھ ہی چلتا رہا۔ پھر شاید کوئی دوسری جماعت میرے اور ان کے بیچ حائل ہو گئی۔

طواف گرچہ بالکل انفرادی عمل ہے، اور بقول نفیس صاحب کتاب دیکھ کر دعا پڑھنا یا ایک شخص کا زور سے پڑھنا اور دوسروں کا دہرانا مکروہ ہے، یہ بھی صحیح ہے کہ اگر ایک بڑا گروپ آپ کے آس پاس اجتماعی طور پر دعائیں پڑھ رہا ہو تو آپ دل جمعی اور یکسوئی کے ساتھ اپنی توجہ مرکوز نہیں رکھ سکتے، پھر بھی ان کی اثر انگیزی دل و دماغ پر اس طرح پھیل جاتی ہے کہ جس کو براہِ راست مشاہدہ نہ ہو وہ اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتا۔ طے ہوا تھا کہ طواف کے بعد سب اس

سیڑھی کے پاس جمع ہوں گے جہاں سے سعی کے لیے صفا کی طرف جانا تھا۔ وہاں بھی کوئی نہیں دکھا۔ شاید سب چلے گئے تھے یا ابھی طواف سے فارغ ہی نہیں ہوئے تھے یا میری ہی طرح دوسروں کو ڈھونڈھ رہے تھے۔ میں نے سب کی تلاش میں وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور زمزم پی کر سعی کے لیے صفا کی طرف بڑھ گیا۔

بظاہر یہ کام بڑا مشکل معلوم ہوتا ہے کیونکہ لوگوں کا ایک سیلاب ایک طرف سے آتا اور دوسری طرف جاتا دکھائی دیتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس اُمڈتے ہوئے سیلاب میں کوئی کودے کیسے۔ لیکن جیسے تیرنا سیکھنے کے لیے پانی میں کودنا ضروری ہے ویسے ہی سعی کرنے کے لیے اس سیلاب کے ساتھ بہ جانا ضروری ہے۔ آگے بڑھتے ہی سمجھ میں آ گیا کہ اس مجمع اور طواف کے مجمع میں بہت فرق ہے۔ طواف میں گول گھومتے ہوئے قریب ہوتے جانے کی ایک فطری خواہش خانہ کعبہ کی دیواروں کے آس پاس زبردست دباؤ پیدا کرتی ہے لیکن سعی میں ایک ہی طرف بڑھتا ہوا مجمع بڑی آسانی سے کسی کو قبول کر لیتا ہے۔ ہر شخص کشادگی کے ساتھ یہ دوری طے کرتا ہے۔ صرف صفا یا مروہ کی پہاڑی کے پاس پہنچ کر بھیڑ اور دباؤ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے کیونکہ ہر شخص یہاں رکتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ یہاں سے کعبہ پر ایک نگاہ ڈالے اور دعا کرے۔ کچھ لوگ تو وہیں دیواروں سے لگ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہی دوسروں کے لیے، اور اپنے لیے بھی پریشانی پیدا کرتے ہیں۔

میں نے بعض سادہ لوح لوگوں کو صفا اور مروہ دیکھنے کے بعد بہت پریشان دیکھا ہے۔ میرے ساتھ زیادہ تر بنگال کے اور کچھ آسام کے لوگ تھے۔ ایسے لوگ جو اپنے ساتھ ماچس، موم بتی اور چھوٹی سی ٹارچ بھی لے کر آئے تھے تاکہ بجلی جانے پر جلا سکیں اور اسی کی روشنی میں شیطان کو مارنے کے لیے مزدلفہ سے کنکر چن سکیں۔ ایک صاحب بولے کہ ان کے گانو میں جو حجاج کرام کی ٹریننگ ہوئی تھی اسی میں ایسا بتایا گیا تھا۔

ایسے لوگ اسی چٹیل میدان کا تصور لے کر آئے تھے جس میں موجود دو چھوٹی پہاڑیوں کے درمیان انہیں تیز چال میں چلنا تھا اور بیچ میں تھوڑی دور تک حضرت ہاجرہ کی اتباع میں دوڑنا بھی تھا۔اب تو سعی کے لیے کوئی چاہے تو پہلی منزل پر چلا جائے، یا دوسری یا تیسری منزل پر۔ ہر منزل پر اسی طرح صفا سے مروہ کی طرف جانے اور گھوم کر لوٹنے کا راستہ بنا ہوا ہے۔ درمیان میں وھیل چیر والوں کے لیے جگہ چھوڑی گئی ہے۔کافی اونچی چھت، چاروں طرف ماربل اور ٹائلز لگے ہیں۔ جگہ جگہ آب زمزم کے نل لگے ہیں کہیں بھی ایسا کچھ نہیں جو اس جگہ کی قدامت کا مظہر ہو۔ صرف دونوں سروں پر پہاڑی کی علامت کے طور پر تھوڑا تھوڑا پتھریلا نمونہ چھوڑ دیا گیا ہے۔صفا کی طرف اسے سلیقے سے گھیر کر رکھا ہے اور مروہ کی طرف اس کے گرد کوئی گھیرا تو نہیں لیکن ایکریلک یا پلاسٹک جیسی کوئی شفاف پرت اوپر سے ڈال دی گئی ہے۔تاکہ یہ مزید گھسنے سے محفوظ رہے۔ چونکہ اس کثرت سے لوگ اس پر چڑھے یا بیٹھے رہتے ہیں اور دعائیں کرتے یا اسے چومتے یا چھوکر ہاتھوں کو آنکھوں سے لگاتے رہتے ہیں، کہ یہ حصہ نزدیک آنے پر بھی دکھائی نہیں دیتا۔انجان شخص عموماً اس سے ٹھوکر کھا جاتا ہے۔بہتر تو یہی ہے کہ اس کے گرد بھی صفا کی طرح شیشے کی سی شفاف سخت دیوار بنادی جائے۔

سعی کے راستے میں دونوں طرف تھوڑی دور تک سبز ٹیوب لائٹ سے ایک دوری کو متعین کر دیا گیا ہے جس کو دوڑ کر پار کرنا ہوتا ہے یہ رمل نہیں ہے بلکہ جھٹک کر تیز قدموں سے چلنا ہے۔دوسرے یا تیسرے چکر میں ذہن اس فرق کی طرف گیا تو اچانک لگا کہ ذہن میں کئی گرہیں کھلتی چلی گئیں۔

پہلی بات جو ذہن میں آئی وہ یہ کہ دوڑنا یا لپکنا بھی تو بہت طرح کا ہوتا ہے۔آخر یہ کس طرح کا دوڑنا ہے؟

جواب بلا تاخیر ذہن کے ہی کسی گوشے سے ابھرا کہ اس میں کیا الجھن ہے، یہ دوڑنا ایسا ہی ہونا چاہیے جیسا کوئی بے چین ماں اپنے پیاسے بچے کو آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دینے کی فکر میں دوڑے۔ بے ساختہ رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ماں کی ممتا کو اتنی اہمیت پوری انسانی تاریخ میں کبھی نہیں دی گئی۔ یہ اسلام میں ہی ممکن ہے۔ اسی رو میں یہ مصلحت بھی حل ہو گئی کہ صرف مردوں کو دوڑنے یا لپکنے کا حکم ہے عورتوں کو نہیں۔ اس لیے کہ عورتیں تو اس ممتا سے واقف ہیں ہی۔ ان کو اس کا کیا احساس کرانا !

صوالین ۹

سعی بھی انفرادی عمل ہے لیکن اسے بھی کئی ممالک کے حجاجِ کرام طواف کی طرح بڑی اجتماعیت کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ انڈونیشیا، تھائی لینڈ، سوڈان، یمن، نائجیریا، چین، سومالیہ، کوریا، ترکی اور ایران وغیرہ سے آئے ہوئے حجاج کو ایک فوجی یونٹ کی طرح متحرک دیکھنا ایک تجربہ ہوتا ہے — ایک جیسے کپڑے، عورتوں کے ایک طرح کے برقعے یا چادریں، گردن میں اوپر سے پہنے ہوئے ایک سے رنگین رومال، جن کے درمیان سے سر ڈالنے کے لیے گول جگہ کاٹ کر بنائی رہتی ہے اور اس پر ملک کا نام یا اس دستے کی پہچان بنی رہتی ہے، اپنے سروں کے گرد ایک جیسے رنگین ربن باندھے ہوئی عورتیں، کاندھے پر ایک ہی طرح کا بیگ لٹکائے عورتیں — یہ گروپ کبھی کبھی کندھے پر لٹکائے جانے والا چھوٹا سا میگا فون لیے دعائیں پڑھتے ہوئے بڑے نظم و ضبط سے آگے بڑھتا رہتا ہے۔ اس تنظیم سے ان کو تو بہت آسانی ہوتی ہے لیکن غیر منظم لوگ بڑی پریشانی میں پڑ جاتے ہیں۔ عام طور پر ہندوستانی یا پاکستانی ان سے پریشان دکھائی دیتے ہیں اور ان سے دھکا لگنے کی شکایتیں کرتے ہیں۔ ان میں بعض خصوصاً افریقی ممالک سے آئے ہوئے چونکہ عموماً لمبے تڑنگے اور ہٹے کٹے ہوتے ہیں اس لیے ان کے ساتھ ہوئی ہلکی سی رگڑ بھی تکلیف دہ ہو جاتی ہے۔

ان کے اس طریقے پر ہم انگلیاں اٹھا سکتے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ حج کے ایام میں ان میں سے شاید ہی کوئی اپنے ساتھیوں سے بچھڑتا ہو یا گم ہوتا ہو، جبکہ ہم پانچ آدمی بھی ساتھ چلیں تو پوری احتیاط کے باوجود طواف اور سعی کے بعد دو یا تین ہی ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔

باقی کا اللہ مالک ہے۔ اگر صحیح اندازے سے اسی دروازے سے باہر نکلے جس سے داخل ہوئے تھے اور واپسی کا راستہ بھی ذہن میں محفوظ رہا تو ٹھیک ورنہ دو گھنٹے سے دو دن تک کی فرصت ہوگئی۔ اجنبی جگہ، بے پناہ مجمع، عمارات کی ساخت کی یکسانیت، زبان کی عدم واقفیت اور تجربے کی کمی کے سبب عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔

سعی کے بعد حلق کرانا یعنی سر کے بال اتارنا ضروری تھا۔ سنا تھا کہ آس پاس ہی بہت سے حجام مل جاتے ہیں۔ بہت سے لوگ توجہ کرنے کے نام پر جاتے ہیں اور اس دوران سب کے سر پر ہاتھ صاف کر کے خاصی رقم بنا لیتے ہیں۔ مروہ کی طرف سے باہر نکلتے ہوئے قینچی سے بال کاٹ کر ڈسٹ بن میں ڈالتے ہوئے بہت سے لوگ دکھائی دیے۔ لیکن یہ کام چونکہ غیر تجربہ کار ہاتھوں سے ہو رہا تھا اس لیے سر پر جو نقشہ ابھر رہا تھا وہ بڑا عبرت ناک تھا۔ کئی لوگوں کو سیفٹی ریزر سے ایک دوسرے کی کھوپڑی صاف کرتے ہوئے بھی دیکھا۔ اس میں بھی ان کی ناتجربہ کاری نے عبرت کے سامان پیدا کر دیئے تھے۔ اکثر کے سر پر جا بجا خون کے دھبے اور خراشیں پھیلی تھیں۔ بدن سے خون نکلنے کی وجہ سے ان پر قربانی بھی واجب ہوگئی۔ اس وحشت ناک نظارے کے بعد میں اس طرف بڑھا جدھر کئی لوگوں کی دی ہوئی اطلاع کے مطابق حلاقہ تھا، یعنی قطار سے حلق کرنے والوں کی دکانیں تھیں۔ آگے بڑھے تو ایک جگہ دیوار پر پینٹ سے بڑا سا تیر کا نشان بنا ہوا اور 'صوالین' لکھا دکھائی دیا۔ میں 'سعالین' تو سمجھتا تھا لیکن یہ لفظ نیا تھا۔ پھر ذہن نے خود ہی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا اور سمجھ میں آ گیا کہ یہ 'صالون' یعنی SALOON کی جمع ہے۔ وہاں کی بھیڑ اور تیز ہوتی ہوئی دھوپ نے دماغ میں یہ بات بھی ڈالی کہ یہ کام یہیں کرنا کیا ضروری ہے۔ عزیزیہ میں قیام گاہ کے بالکل پاس کئی صالون دیکھ چکا تھا۔ فیصلہ ہو گیا وہیں چل کر یہ فریضہ انجام دیا جائے تا کہ عمرہ مکمل ہو سکے۔

اپنی حاصل کی ہوئی جانکاری اور وہاں کھڑے اہل کاروں سے اس کی تصدیق کرنے کے بعد حضور ﷺ کے آبائی مکان کے بغل کے راستے سے اوپر کی طرف بڑھا۔ جہاں سے سواری ملنے کا امکان تھا۔ اس وقت وہاں تین ٹیکسیاں تھیں۔ پہلی دو نے عزیزیہ کی طرف جانے سے انکار کردیا۔ تیسرے نے پیتہ سمجھ کر عشرہ ریال عشرہ ریال کا نعرہ لگایا میں بڑے اطمینان سے دروازہ کھول کر بیٹھنے لگا تو اس نے سوال کیا۔۔۔ کم نفر؟

اتنی عربی سمجھ میں آنے لگی تھی کہ پوچھ رہا ہے 'کل کتنے آدمی ہو؟' میں نے جواب دیا 'واحد'۔ اس نے کچھ غصے اور کچھ مایوسی میں میری طرف دیکھا۔ پھر اشارہ کیا کہ بیٹھے رہو، اور آواز لگانے لگا عزیزیہ، عزیزیہ گویا دو چار اور ہو جائیں تو چلیں۔ میں نے سنا تھا کہ یہاں پر کافی بھیڑ ہوتی ہے اور ٹیکسی بمشکل ملتی ہے۔ یہاں صورتحال مختلف تھی، کئی بار نیچے اترا کئی بار بیٹھا۔ لیکن عزیزیہ کی طرف جانے والا کوئی اللہ کا بندہ ادھر آ ہی نہیں رہا تھا۔ ظہر کا وقت قریب آ رہا تھا۔ شاید یہ بھی ایک وجہ رہی ہو۔ میں حرم سے نکلا تھا تو ظہر میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ اب بمشکل دس منٹ رہ گئے تھے۔ ادھر وہاں کھڑے پولس والے ٹیکسی کو بار بار آگے بڑھانے کا اشارہ کر رہے تھے جسے وہ کبھی دانت دکھا کر اور کبھی کچھ عاجزی ظاہر کر کے ٹال رہا تھا۔ جب ان کا دباؤ زیادہ بڑھا تو اس نے مجھ سے اپنی رواں عربی میں کچھ فرمایا۔ منھ سے تو نہیں لیکن اس کے ہاتھ کے اشارے سے میں اس کا عندیہ سمجھ گیا کہ 'اگر اجازت دو تو ایک چکر کاٹ کر پھر ادھر آتا ہوں۔ شاید تب تک کچھ سواریاں آجائیں۔' میں نے فراخدلی سے اجازت دے دی۔ اب تو دیر ہو ہی چکی تھی، تھوڑی دیر اور سہی۔

سامنے دو سرنگیں تھیں۔ ایک جانے اور دوسری ادھر سے آنے کے لیے۔ یہاں رائٹ ہینڈ ڈرائیو ہے۔ سڑک پر بھی سوار اور پیدل سب دائیں سے ہی چلتے ہیں۔ اس نے دائیں سرنگ میں گاڑی بڑھا دی۔ اس پار جا کر نیچے کی سڑک پر گیا۔ پھر چکر کاٹ کر واپس لوٹنے کی سرنگ کی

طرف بڑھا۔ اس دوران عـزیـزیه، عزیزیه کی صدا بلند کرتا گیا لیکن کسی کو رحم نہیں آیا۔ اس بیچ کئی ٹیکسیاں الگ الگ جگہوں کو جا چکی تھیں۔ اس کے واپس لوٹتے ہی ایک دبلے پتلے پولس والے نوجوان نے اس ڈرائیور کو تاڑ لیا اور اپنی نوٹ بک نکال کر اس کا نمبر نوٹ کرنے لگا۔ یہ اپنی سیٹ سے اتر کر دوڑا۔ دونوں میں دیر تک مان منول چلتی رہی پھر غالباً پولس والے کو اس پر رحم آ گیا۔ اسی وقت دو لوگ ٹیکسی کے پاس پہنچے۔ میں نے جلدی سے کہا ــــ عـزیـزیـه عزیزیه دونوں خوش ہوئے اور بولے ــــ ''ہاں، ہاں عزیزیہ''، ڈرائیور دوڑا آیا۔ تب تک دو اور لوگ عزیزیہ کی ٹیکسی تلاش کرتے آ گئے۔ میں اتر کر آگے آ گیا۔ وہ چاروں پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔

عزیزیہ خاصہ پھیلا ہوا علاقہ ہے اور شمالیہ اور جنوبیہ کہے بغیر بات نہیں بنتی۔ اتفاق سے سب جنوبیہ کے ہی تھے لیکن سب کے پتے الگ الگ۔ نہ کسی کو راستہ دیکھا ہوا، نہ کوئی اپنی منزل کی تفصیلات سمجھا پانے پر قادر۔ میں نے چونکہ پہلے ہی الـمستشفی علوی تونسی سمجھا دیا تھا اس لیے میری طرف سے وہ مطمئن تھا۔ لیکن جب تک ان کے پتے سمجھ میں نہ آئیں، روٹ کیسے طے ہو۔ ادھر سپاہی کی سیٹی اور پھٹکار۔ بہر حال ٹیکسی آگے بڑھی۔ پیچھے دو لوگ ممبئی سے تھے اور دو بنگلہ دیش سے۔ چاروں اردو بولتے سمجھتے تھے۔ میں نے ان کے پتے سمجھنے کی اور ڈرائیور کو سمجھانے کی کوشش میں اپنی عربی دانی کا پورا پورا مظاہرہ کیا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا ہوگا، ویسے وہ بھی یہی ظاہر کرتا رہا کہ سب کچھ سمجھ رہا ہے۔

دونوں نے اپنے پتے انگلش میں لکھ رکھے تھے۔ وہ ڈرائیور کے لیے بیکار تھے اور ڈرائیور کے سوالات ان کے لیے بے معنی۔ لہٰذا ہر موڑ اور ہر ٹریفک سگنل پر ڈرائیور بے چارگی سے پلٹ کر ان کی طرف دیکھتا۔ چاروں بیک وقت اپنے اپنے پتے سمجھاتے پھر ڈرائیور مجھ سے مشورہ کرتا۔ میں ظاہر ہے اس کی بات پر بے سمجھے سر ہلا کر حامی بھرتا۔ وہ مطمئن ہو کر کسی

ایک طرف اندازے سے بڑھ جاتا۔ ٹیکسی عزیزیہ کے علاقے میں ہی چل رہی تھی۔ اچانک ممبئ والوں کو کچھ جانی پہچانی عمارتیں دکھائی دیں۔ پھر بن داؤد کا ایک بڑا سا مال (Mall) دکھائی دیا۔ اس گروپ کے مال اور سپر مارکٹ یہاں بڑی تعداد میں ہیں۔ اسے دیکھتے ہی ان کی مسرت آمیز چہکار گونجی۔ میں نے پوچھا — اس جگہ کو پہچان رہے ہو؟ یہاں سے اپنی جگہ پر پہنچ سکتے ہو؟ وہ بولے — ''ہاں چلے جائیں گے۔'' اب مسئلہ بنگلہ دیش والوں کا تھا۔

اتفاق سے ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی پٹرول پمپ میں داخل کر دی۔ میں نے وہاں کے دو کارکنان کو اردو بولتے سن کر مخاطب کیا اور ان دونوں حضرات کے پتے دکھائے۔ انہوں نے سمجھ کر ڈرائیور کو عربی میں سمجھا دیا۔ دونوں خوش خوش اپنی منزل پر پہنچے۔ یوں عزیزیہ پہنچنے میں مجھے ڈیڑھ گھنٹے ضرور لگے لیکن اب تک اس علاقے کا ایک اچھا خاصہ نقشہ میرے ذہن میں بیٹھ چکا تھا اور راستوں کا بھی تھوڑا اندازہ ہوا۔ وہ بھی دس ریال میں!

ٹیکسی والے نے مجھے بالکل صحیح جگہ پر ڈراپ کیا اور میں قیام گاہ کی طرف جانے سے قبل 'صالون' کی طرف بڑھا، کیونکہ بغیر یہاں گئے عمرہ مکمل ہی نہیں ہوتا۔ اس درمیان یہ خیال آیا کہ ابھی تو ایک بار حج کے بعد بھی سر منڈانا ہے اس لیے سر پر کچھ بال رہنے چاہئیں۔ دل نے کہا کہ 'قصر' کرایا جائے 'حلق' نہیں۔ حالانکہ حلق کی فضیلت زیادہ ہے۔ پھر یہ بھی دلیل ذہن میں آئی کہ دو طریقے ہیں دونوں پر عمل ہو جائے۔ ایک بار قصر ایک بار حلق۔ عمرہ کے ساتھ قصر اور حج کے بعد حلق۔ اسی فیصلے کے ساتھ ائر کنڈیشنڈ صالون میں داخل ہوا تو لسکر صاحب بیٹھے مشین سے قصر کرا رہے تھے۔ انہوں نے بھی اپنے طور پر ٹھیک وہی فیصلہ کیا تھا۔ میں نے بھی یہی کیا اور دس ریال ادا کیے۔ یعنی اپنی کرنسی میں سوا سو روپے۔ وہاں سے باہر نکلتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ میری اتنی مہنگی حجامت پہلے کبھی ہوئی تھی یا نہیں۔ پھر یہ بھی سوچا کہ ابھی تو ایک مہینے سے زیادہ رہنا ہے۔ دیکھیں آگے کیا ہوتا ہے۔

قربانی کاوقت

جمعہ کا دن۔ صبح سے ہی ارادہ تھا کہ حرم شریف جانا ہے، جمعہ کی نماز وہیں پڑھنی ہے۔ ناشتے سے فارغ ہوتے ہی نفیس صاحب نے آواز لگائی تمام حضرات تھوڑی دیر ٹھہریں گے قربانی اور امانت کی بات کرنی ہے۔ اہم معاملہ تھا۔ سب رُک گئے۔ نفیس صاحب ہمیشہ ایک پنتھ دو کاج کرتے ہیں۔ انہوں نے سب کو بٹھاتے ہوئے کہا۔۔۔

''درود شریف پڑھیں بھئی۔ درود شریف پڑھ لیں۔ ذرا قریب قریب آجائیں بھئی۔''

اس کے بعد تھوڑی سی تمہیدی گفتگو کے بعد ماحول بنا کر انہوں نے حج سے متعلق کچھ احادیث اپنی کتاب سے پڑھیں، پھر قربانی کے سلسلے میں واضح کیا۔۔۔

''یہاں کئی طرح کے سسٹم رائج ہیں۔ ایک تو الراجحی بینک میں 410 ریال جمع کرا کر رسید ملتی ہے۔ اب قربانی ان کے ذمے۔ آپ حج کے ارکان ادا کیجیے اور حلق کرایئے احرام کھول لیجیے۔''

ایک صاحب نے کہا۔۔۔

''میں نے بینک میں رقم جمع کرا دی ہے۔ وہاں سے دس بجے دن کا وقت ملا ہے۔ میں ساڑھے دس بجے حلق کرالوں گا۔''

نفیس صاحب مسکرائے اور بولے۔۔۔

''ان حضرات کے نزدیک ترتیب کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ترتیب ہم احناف کے نزدیک واجب ہے۔ ہم پہلے ارکان حج ادا

کریں گے پھر رمی کریں گے پھر قربانی۔ تب ہی حلق کے بعد احرام کھول سکتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس کی اہمیت نہیں۔ جو بھی پوچھے اس کو یہ دس بجے کا ہی وقت بتاتے ہیں۔ یہ نام بھی نہیں درج کرتے کہ آپ کے نام سے قربانی ہو سکے۔ آپ کا دل بھرے تو بینک میں جمع کیجیے۔ قربانی تو ہو ہی جائے گی۔ کب ہو گی اس کی گارنٹی نہیں۔"

وہ صاحب تردد میں پڑ گئے۔ اب کیا کریں جمع کر چکے ہیں۔ لوگوں نے تسلی دی—

"اللہ نیت دیکھتا ہے۔ اللہ نیت دیکھتا ہے۔"

نفیس صاحب کا بیان جاری تھا—

"کچھ لوگ یہاں آپ سے پیسے لے لیں گے اور کہیں گے کہ آپ کو قربانی کا گوشت بھی دیں گے۔ دیتے بھی ہیں لیکن اللہ معاف کرے، ایک جانور میں سے بیس لوگوں کو گوشت دے دیتے ہیں۔ آپ بھی خوش، وہ بھی خوش۔"

لوگ حیرت سے سن رہے تھے۔ انہوں نے بات آگے بڑھائی—

"پہلے ہم لوگ بھی لوگوں سے پیسے لے لیتے تھے اور کسی سے معاملہ کر کے قربانی کرا لیتے تھے۔ اس میں ہمارا بھی کچھ مارجن ہوتا تھا، یہ بھی حقیقت ہے۔ وہ ہم کو بلا لیتے تھے اور جانور کی گنتی کرا دیتے تھے۔ دیکھ لیجیے، گن لیجیے۔ قربانی ہمارے سامنے ہوتی تھی۔ وہ ہم سے کہتے تھے آپ کے پاس سارے حجاج کی لسٹ ہے آپ نام پڑھتے جائیے۔ ہم قربانی کے بعد اس میں سے پانچ چھ جانور لے بھی آتے تھے اور اپنے حجاج کو قربانی کا گوشت بھی کھلاتے تھے۔ پھر حقیقت معلوم

ہوئی تو ہم نے کان پکڑ لیے۔ معلوم ہوا یہی جانور آٹھ دس ٹریول والوں نے اپنے اپنے طور پر گن لیے ہیں۔ قربانی ہو رہی ہے اور سب اپنی اپنی لسٹ سے نام پڑھ رہے ہیں۔ خیر ہم نے تو جو توبہ اور استغفار کرنا تھا وہ کیا اور یہ طریقہ بند کر دیا۔"

— کہتے کہتے وہ آنکھیں خشک کرنے لگے۔ آواز رندھ گئی تھی۔ ہم لوگ دم بخود تھے —

"گذشتہ کئی برسوں سے ہم مدرسہ صولتیہ میں رقم دے دیتے ہیں وہ بڑی ذمہ داری اور دینداری کے ساتھ یہ کام کرتے ہیں سب کے نام کی لسٹ لے لیتے ہیں۔ پہلے سے وقت بتا دیتے ہیں۔ ہم جا کر دیکھ بھی آتے ہیں اور فون سے بھی تصدیق کر لیتے ہیں کہ سب کی قربانی ہوگئی، تب ہم اپنے حاجیوں سے کہتے ہیں کہ حلق کرائیے اور احرام کھول لیجیے۔"

سب کا اطمینان ہو گیا۔ یہ حنفی مدرسہ خانۂ کعبہ کے بالکل پاس تھا اور اسے بنگال کی ایک خاتون نے رفاہِ عام کے لیے قائم کیا تھا۔ حرم کی توسیع کے سلسلے میں اسے اب کافی دور کعکیہ میں جگہ ملی ہے۔ ہم سب نے 350 ریال فی کس کے حساب سے اپنی اپنی رقم جمع کرادی۔

انہوں نے کہا کہ چونکہ آپ کو منیٰ، عرفات اور مزدلفہ میں زیادہ رقم کی ضرورت نہیں۔ وہاں سے ایک دو بار حرم یا عزیزیہ آنے جانے لائق رقم اور کچھ فاضل پیسے اپنے پاس رکھ کر بقیہ رقم چاہیں تو امانت کے طور پر جمع کرادیں اور حج سے لوٹ کر لے لیں۔ آپ چاہیں تو کمرے میں چھوڑ کر جا سکتے ہیں لیکن کسی ناگہانی کی صورت میں کوئی ذمہ دار نہیں ہوگا۔ اپنے ساتھ رکھنے میں جیب کٹ جانے یا گر جانے کا خطرہ ہے۔ گر جانے کی حد تک تو ہم بھی متفق تھے لیکن جیب کٹنے کی بات ہم سے ہضم نہیں ہوئی۔ منیٰ میں، مزدلفہ میں، عرفات میں ایسی جگہوں پر کون پاکٹ مارے گا۔ نفیس صاحب کی تجربہ کار آنکھوں نے یہ بے اعتباری ہماری آنکھوں سے پڑھ لی۔ انہوں نے

کئی واقعات سنائے اور وضاحت کی کہ یہاں بلیڈ مار کر پیسے نکال لینے والے استاد بہت ہیں۔ بالاخر ماننا پڑا کیوں کہ جمرات بھی یہیں ہے جہاں تین شیاطین کو پتھر مارنے کا حکم ہے۔ آخر اس کا بھی تو حلقۂ اثر ہوگا ہی۔

انہی باتوں میں نو بج گئے۔ حرم شریف جانے کی فکر تھی۔ ہماری قیام گاہ کے باہر سڑک پر ٹکسیاں گذرتی ہوئی حرم حرم پوچھتی ہیں۔ پرائیویٹ کاروں سے جانے والے بھی اگر ادھر جارہے ہوں تو روک کر حرم حرم پوچھ لیتے ہیں۔ اسی وقت حرم سے رضوان کریمی نے فون کیا تو معلوم ہوا کہ ساری جگہیں بھر چکی ہیں۔ ان لوگوں کو بیسمنٹ میں جگہ ملی ہے۔ اب یہاں سے جاتے جاتے تو سڑک پر بھی جگہ نہیں ملے گی۔ اسی وقت جن لوگوں کے موبائل میں ایک مہینہ کی مدت والا سم کارڈ تھا ان پر میسیج آنا شروع ہوگیا کہ حرم شریف میں بھاری تعداد میں نمازیوں کی آمد کی وجہ سے ادھر جانے کے سارے راستے ٹریفک کے لیے بند کر دیئے گئے ہیں۔ مجبوراً طے ہوا کہ نماز جمعہ یہیں آس پاس پڑھی جائے۔

پنج وقتہ نمازوں میں ہم عموماً سامنے کی 'مسجد حضرت کعب بن مالکؓ' میں جاتے تھے۔ ارادہ ہوا کہ دوسری مسجد میں چلیں۔ اسی سڑک یعنی 'شارع عبداللہ خیاط' پر تھوڑا آگے ایک اور بڑی مسجد تھی ہم دو لوگ وہیں چلے گئے۔ معلوم ہوا کہ اس کا نام مسجد حضرت عمر بن خطابؓ ہے، خوشی ہوئی لیکن یہ دریافت کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ اس کا کوئی تعلق بھی حضرت عمرؓ سے ہے یا صرف نام رکھ لیا ہے جس طرح ہمارے یہاں مسجد فاطمہؓ، مسجدِ عمرؓ، مسجدِ بلالؓ، وغیرہ نام رکھے جاتے ہیں۔

چھ حج چھیالیس عمرے

ہمارا گروپ کل 117 افراد پر مشتمل تھا۔ 25 لوگ ہم سے دو دن قبل آ گئے تھے بقیہ اس سفر کے سرد و گرم میں ایک ساتھ تھے۔ چار پانچ دن کے ساتھ میں زیادہ تر لوگوں سے تعارف ہو چکا تھا۔ بڑا دلچسپ گروپ تھا۔ ڈاکٹر، انجینئر، پروفیسر، اڈیٹر، ٹھیکیدار، تاجر، امام، مفتی، طالب علم، خواتین خانہ سب شامل تھے۔ چار کے لیے وہیل چیئر تھی۔ جن پر ان کے اعزہ انہیں ہر جگہ لے جاتے تھے۔ وہ حسب ضرورت تھوڑا بہت چل پھر لیتے تھے لیکن بھیڑ بھاڑ کی جگہ پر یا تیز چلنے سے معذور تھے۔ ہم لوگ ان کے اعزا کے حوصلے کی داد دیتے تھے اور انہیں بڑی رشک بھری نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کئی ضعیف حضرات تھے جو وہیل چیئر کی منزل سے تھوڑے پیچھے تھے۔ ان کو دیکھ کر افسوس بھی ہوتا تھا اور ان کی ہمت کی تعریف بھی کرنی پڑتی تھی۔

ہمارے ساتھ ایک شخص تو تقریباً نابینا تھے۔ تقریباً اس لیے کہ روشنی اور اندھیرے میں تمیز کر لیتے تھے اور روشنی میں ہیولیٰ دیکھ کر سمجھ جاتے تھے کہ آگے کوئی چیز ہے۔ باقی کا کام اندازے اور آواز پر چل رہا تھا۔ کمال یہ کہ ان کا کوئی سگا بھی ان کے ساتھ نہیں تھا۔ دو شناسا لوگوں نے اس سفر میں ان کو پورا تعاون دینے اور ان کی ذمہ داری اٹھانے کی گارنٹی لی تب جا کر ٹور والوں نے انہیں لانے کی رضا مندی دی۔ ان میں سے ایک نے بتایا کہ انہوں نے نفیس صاحب سے کہ دیا تھا کہ یہ پوری طرح نابینا نہیں ہیں۔ انہیں تھوڑا تھوڑا دکھائی دیتا ہے۔ تبھی جا کر وہ تیار ہوئے۔ اللہ ان کے اس جھوٹ کے پیچھے چھپے سچے جذبے کو قبول کرے، اور ان کو بصارت اور بصیرت دونوں سے سرفراز رکھے۔ آمین!

ان دولوگوں میں ایک تو خاموش طبع اور گوشہ گیر قسم کے شخص تھے لیکن دوسرے شخص تھے صابر بھائی۔پورے گروپ میں سب سے بلند آواز والے اور سب سے متحرک۔اذان دینی ہے؟ ـــ 'صابر بھائی!' اقامت کہنی ہے؟ـــ 'صابر بھائی!' کھانے یا چائے کے لیے لوگوں کو آواز دینی ہے؟ـــ 'صابر بھائی!' آگے آگے آواز دیتے ہوئے چلنا ہے؟ـــ 'صابر بھائی!' دستر خوان لگانا ہے؟ـــ 'صابر بھائی!' فجر میں سب کو جگانا ہے؟ـــ 'صابر بھائی!'ـــ آواز میں ہلکی سی لکنت تھی۔لیکن دم پورا تھا۔انہیں نام دیا گیا گروپ کے 'لاؤڈ اسپیکر'۔ ہنستا بولتا ہوا یہ آدمی اس وقت عجیب لگا جب کسی بات پر جذباتی ہوگیا۔پھر کہاں گئی آواز اور کہاں گیا کھلنڈرا لب ولہجہ۔ آنکھوں سے موسلا دھار بارش ہو رہی ہے، گلا رندھ گیا ہے، ماں باپ یاد آ گئے ہیں۔ان کے لیے دعائیں ہو رہی ہیں۔بچپن یاد آ گیا۔پاس میں بیٹھے شخص کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیاـــ

''پروفیسر صاحب، ہم سیمنٹ میں مٹی ملانے والا آدمی ہے۔پتہ نہیں اللہ کو ہمارا کون سا ادا پسند آ گیا کہ ہم کو تیسرا بار اپنے گھر آنے کا موکا دیا ہے۔''

دو دن بعد یہی آدمی عزیزیہ کی قیام گاہ کی سیڑھیوں پر فجر کے بعد بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے ہنس ہنس کر بتا رہا تھاـــ

''آپ کو معلوم ہے، پہلا بار ہم جب آئے تھے تو سب ارکان پورا نہیں کیے۔کون اتنا دوڑ بھاگ کرے گا۔ادھر دوڑو، ادھر دوڑو، جو جو آسانی سے ہوا وہی کیا۔نفیس بھائی کو بتایا بھی نہیں، دم بھی نہیں دیا۔اللہ نے کہا، پھر جاؤ۔دوسرا بار آیا تو شیطان کو ایک ہی بار کنکر مارا، وہ بھی سارا کنکر مٹھی میں لے کے ایک بار مار دیا۔اس بار بھی کسی کو بتایا نہیں۔دم بھی نہیں دیا۔دیکھو اللہ پاک پھر بلا لیا۔اس بار سب کر لیا ہے۔لیکن مکہ مدینہ میں جتنا نماز

جماعت سے پڑھنا ہے اتنا نہیں پڑھے گا۔ اللہ پھر بلائے گا 2012ء میں۔''

ہم لوگوں پر حیرت کا عالم طاری تھا۔ ایک دن موڈ میں تھے۔ بولے ـــــ

''بہت غریبی میں بچپن بتایا ہے۔ کیا بتائیں۔ ایک ٹائم کھاتا تھا، ایک ٹائم کا فکر کرتا تھا۔ خیراتی اسکول میں تھوڑا بہت پڑھائی بھی کیا۔ ٹھیلہ بھی کھینچا، مزدوری بھی کیا۔ سب کیا۔ دل میں کہتا تھا اللہ پاک ای بھی کوئی جیون ہے۔ ایک بار کیا ہوا۔ ہمارا پاس میں ایک آدمی منت مانا تھا کہ اجمیر جائے گا۔ کچھ ارجنٹ کام پڑ گیا۔ جانے نہیں سکا۔ ہم سے بولا ـــــ 'صابر اجمیر جائے گا'۔ ہم بولا ـــــ 'چلا جائے گا'۔ اس نے 13 سو روپیہ دیا۔ ہم اس کے جگہ پر چلا گیا۔ آنے جانے کھانے پینے میں سب ملا کر 300 خرچا کیا۔ ایک ہزار بچا لیا۔ اس سے ایک ٹرک بالو خریدا۔ اس کو لا کر بیچا۔ دو سو روپیہ بچا۔ پھر لایا پھر بیچا۔ کرتے کرتے کچھ پونجی بنایا۔ ایک ٹھیکیدار کے ساتھ کچھ دن کام کیا۔ پھر اپنا کام شروع کیا۔ آج بلڈنگ بنا کے بیچتا ہے۔ زمین کا پلاٹنگ کرتا ہے۔ بڑا مکان ہے، گاڑی ہے۔ سب ہے۔ بیوی روز پیسہ پیسہ کرتی تھی۔ آج پیسہ ہو گیا۔ کہیں جانے کے لیے بولتی ہے تو ہم بولتے ہیں ـــــ 'گاڑی لے لو جاؤ'۔ بولتی ہے ـــــ 'نہیں آپ بھی چلیے'۔ ہم کہتے ہیں ـــــ 'تم شوہر کا ساتھ تو مانگی نہیں تھی۔ پیسہ، گاڑی، بنگلا مانگی تھی۔ اب مل گیا تو اسی کے ساتھ خوش رہو''

ـــــ یہ کہہ کر زور کا قہقہہ!

ایک صاحب تھے بڑے معمولی سے۔ایک دن باتوں باتوں میں کہ گئے۔۔۔ ''یہ میرا چھٹا حج ہے۔ 46 عمرے کر چکا ہوں۔اس بار انشاء اللہ چار کرلوں گا تو پچاس پورے ہو جائیں گے۔''ہم لوگ حیرت اور رشک سے انکی طرف دیکھ رہے تھے۔معلوم ہوا کہ ایک سال مکہ اور چھ سال مدینہ میں ملازمت کر چکے ہیں اور سب سے بڑی بات کہ مدینہ میں حضور ﷺ کے روضہ اقدس کی جالیوں کی صفائی پر مامور تھے۔

دو تین نوجوان تھے ان کا انہماک دیکھ کر خوشی ہوتی تھی۔ناشتے کھانے کے وقت عموماً سب سے علیک سلیک ہو جاتی تھی۔ٹور والوں نے بوفے کا نظام رکھا تھا۔فجر کی چائے کے ساتھ ہی بسکٹ، نمکین اور چنا چور وغیرہ کے پیکٹ رکھے رہتے تھے۔کسی پر پابندی نہیں کہ ایک ہی لے۔ پہلے دن زیادہ تر لوگوں نے آزادی کا فائدہ اٹھایا۔کھایا بھی کمرے میں بھی لے گئے۔پھر دوسرے دن بھی اسی فراوانی سے چیزیں دکھائی دیں تو طبیعت سیر ہوگئی۔یہ سامان دن بھر سامنے ہی رہتا تھا۔جب چاہے اٹھا لیجیے۔ناشتہ، دن کا کھانا اور رات کا کھانا اس کے علاوہ۔ان لوگوں نے چکن، مٹن اور مچھلی کا خاص اہتمام کیا تھا۔تین دن میں ہی اندازہ ہو گیا کہ ان سے گزارش کر کے کھانے کو تھوڑا کم مرغن کرانا پڑے گا، ورنہ...

گرد و پیش

عزیزیہ بھی مسفلہ، ام القریٰ اور کعکیہ وغیرہ کی طرح مکہ کا ایک محلّہ ہے، حرم سے کم و بیش چھ کلومیٹر کی دوری پر۔ ہمارا مسکن عزیزیہ جنوبیہ میں تھا۔ عزیزیہ شمالیہ میں بہار حج کمیٹی کے بہت سے لوگ ٹھہرے تھے۔ یہاں ہندوستانی اور بنگلا دیشی کے علاوہ ایرانی اور ترکی حجاج خاصی تعداد میں تھے۔ ہمارے سامنے اور دائیں طرف بڑی بڑی عمارتوں میں ایرانی حجاج تھے۔ تھوڑے یمنی اور سوڈانی بھی دکھائی دیتے تھے۔ اکا دکا تو بہت ملکوں کے ادھر ادھر دکھائی دیے۔ انکے بیگ، یا کمر سے بندھی ہوئی بیلٹ، یا انکے لباس کے پیچھے چھپے ہوئے ملکی کے جھنڈے، یا نام سے، یا ان کے گلے میں لٹکے شناختی کارڈ سے انکی قومیت کا اندازہ ہوتا تھا۔ ایک حاجی تو مقدونیہ (Mecedonia) کا دکھائی دیا جہاں کا سکندر تھا۔

اس علاقے کی عمارات بڑے سلیقے کی اور بلند و بالا ہیں۔ علاقہ پرسکون ہے۔ عام دنوں میں کافی صاف ستھرا رہتا ہوگا۔ آج کل تو آبادی میں ہوئے اس اچانک اضافے کی وجہ سے سڑک کے کنارے جابجا کچرے کے سیاہ پولی تھین کے بڑے بڑے تھیلے رکھے دکھائی دیتے ہیں۔ عمارتوں کے درمیان کی خالی جگہ پر پارک میں بچوں کے لیے جھولے لگے ہیں۔ کھجور کے درخت بھی ہیں۔ لوگوں کو اپنے اپنے مکانوں میں بھی پیڑ پودے لگانے کا شوق ہے۔

ایک دن حرم کی طرف بس سے جاتے ہوئے ایک پہاڑ سے جھرنے کی طرح پانی بہتا دکھائی دیا۔ اس کے نیچے پچاسوں لوگ نہا دھو رہے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو آس پاس کے علاقوں میں ملازمت کرتے ہیں، حج کے لیے آ گئے ہیں اور کہیں جگہ ملنی ممکن نہیں اس لیے سڑکوں کے

کنارے فٹ پاتھ پر یا پارکوں میں یا کسی عمارت کے پہلو میں رات گزار رہے ہیں۔ ذرا اوپر نگاہ اٹھائی تو کبوتروں کے غول کے غول پتھروں پر اتر کر پانی پی رہے تھے اور نہا رہے تھے۔ پتھروں پر لگی کائی سے پتہ چل رہا تھا کہ یہ مستقل جھرنا ہے۔ حیرت ہوئی کہ آس پاس تو خشک پہاڑیاں ہی دکھائی دیتی ہیں کسی پر ہریالی کا نام ونشان نہیں اور یہاں پتھر بھی ہرا ہرا سا دکھائی دیتا ہے۔ گاڑی ٹریفک سگنل پر دیر تک کھڑی تھی۔ نگاہِ تجسس ادھر ادھر گھومتی رہی تو سمجھ میں آیا کہ پانی کے موٹے ربر پائپ پہاڑیوں کے اوپر پہنچائے گئے ہیں۔ یہ پانی انہیں سے نکل کر ادھر ادھر پھیلتا رہتا ہے۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی سوکھی ایڑیوں کے صدقے میں اس ریگستانی علاقے میں ہم بھی جب تک رہے اپنے گھر سے زیادہ پانی خرچ کرتے رہے۔

یہاں پہاڑیوں کے توڑے جانے کا سلسلہ ہر طرف جاری ہے۔ آس پاس پچاسوں ایسی عمارتیں دکھائی دیں جو گذشتہ پانچ سال کے اندر ہی بنی ہوں گی۔ ویسے بہت سی پہاڑیوں کو پوری طرح نہ توڑ کر انکے اوپر ہی مکانات تعمیر کر لیے گئے ہیں۔ اس علاقے میں دکانیں بڑی اور عالیشان ہیں۔ ویسے زیادہ تر علاقوں میں ایسی ہی بلکہ اس سے بہتر ہیں۔ ہماری قیام گاہ سے بائیں مڑتے ہی سڑک پر ایک چھوٹی سی دکان 'بقالہ ابو ماجد' تھی جس میں صابن سے لیکر موبائیل ریچارج واؤچر تک اور بسکٹ سے لے کر بیٹری تک، ضرورت کی بیشتر چیزیں دستیاب تھیں۔ دکان جنوبی ہند کا ایک شخص چلاتا تھا جس سے آپ ہندوستانی میں گفتگو کر سکتے تھے۔ لوگوں نے آس پاس کی کئی اور دکانوں کا ذکر کیا جہاں آپ اپنی زبان بول کر کام چلا سکتے ہیں۔

مسجدیں بہت شاندار اور صاف ستھری ہیں۔ ان میں کافی تعداد میں ائرکنڈیشنر لگے ہیں اور فرش پر دبیز قالین ہیں۔ آس پاس کی مسجدوں میں مسجد حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نسبتاً چھوٹی، مسجد امامہ اس سے بڑی اور مسجد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اس سے تھوڑی بڑی ہے۔ ہر مسجد

میں پیچھے کی جگہ گھیر کر مستورات کے لیے مخصوص کردی گئی ہے۔ مسجد امامہ میں پیچھے کی ایک تہائی جگہ پر دہری چھت بنادی گئی ہے۔ نیچے عورتوں کے لیے اوراس کی چھت پر مردوں کی جگہ ہے۔ اس طرح مردوں کی جگہ بھی کم نہیں ہوئی۔

قرأت عام طور پر ہر جگہ اچھی ہوتی ہے۔ غالبًا ائمہ مساجد کے انتخاب کے وقت حکومت ان کے لحن اور تجوید کا خاص خیال رکھتی ہے۔ ویسے یہاں کے ائمہ مساجد عام طور پر بڑے وجیہ وشکیل اور جامہ زیب ہیں۔ بڑے اہتمام سے آتے ہیں۔ان کے لیے مسجد کی پشت سے راستہ بنایا جاتا ہے۔ادھر سے ہی داخل ہوکر اپنے مصلے پر جاتے ہیں اورادھر سے ہی باہر نکل جاتے ہیں۔اذان دینے، اقامت کہنے اور خطبہ دینے کے لیے مائک مستقل طور پر لگا کر رکھے گئے ہیں جن کی کارکردگی دیکھ کر رشک آتا ہے۔ بالکل صاف آواز جس میں سانس کی آمد ورفت بھی سنائی دے۔آواز کے پیچھے ایک ہلکی سی گونج، جو بھلی معلوم ہوتی ہے۔ نہ 'کھڑ کھڑ' نہ 'چوں چوں' نہ 'ہیلو مائک ٹیسٹنگ'۔

مسواک کا رواج حیرت انگیز حد تک زیادہ ہے۔ وضو کے وقت تو کرتے ہی ہیں کبھی کبھی تو جب اقامت ہورہی ہوتی ہے تب جیب سے مسواک نکالی، دانتوں پر پھرائی، جیب میں رکھی اور اللہ اکبر کہہ کر نیت باندھ لی۔ مجھے تو لگتا ہے بے خیالی میں نماز کے دوران بھی ہاتھ جیب پر چلا جاتا ہوگا۔ یہ شبہ اس لیے ہوا کہ عام طور پر مقامی لوگوں کو نماز کے دوران بھی کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کی عادت ہے۔ کبھی داڑھی کھجالی، کبھی لمبے کرتے کی شکنیں درست کرلیں، کبھی سر سے لٹکے لمبے رومال کے دونوں سرے کندھے کے پیچھے پھیک لیے، کبھی رومال کے دونوں سرے کھینچ کر سر پر اٹکائے ہوئے عقال کو کس لیا، کبھی انگلیاں چٹخالیں ـــــ غرض نماز کے پورے وقفے میں کچھ نہ کچھ حرکت ہوتی ہی رہتی ہی ہے۔

مسجدوں میں دو چیزیں خاص طور پر ذکر کے لائق ہیں۔ ایک تو فولڈنگ کرسیاں جو ہر مسجد میں دکھائی دیں، دیواروں کے ساتھ ساتھ یا پیچھے کی طرف۔ بہت سے لوگ جنہیں جھکنے میں تکلیف ہوتی ہے انہیں کرسیوں پر نماز ادا کرتے ہیں۔ دوسری چیز ہے مسجد کے اگلے حصے میں صفوں کے ساتھ ساتھ اڑکر بیٹھنے کے لیے ایک ڈیڑھ فٹ اونچی ٹیک (Back rest)۔ زیادہ وزن والے یا کمزور لوگ وہاں اس سے پیٹھ لگا کر بیٹھتے ہیں۔ ویسے ممکن ہے یہ قرآن پڑھنے میں سہولت کے لیے بھی بنائے گئے ہوں تاکہ آگے بیٹھے ہوئے شخص کی پیٹھ پیچھے بیٹھے شخص کے قرآن کی طرف نہ ہو۔ مسجدوں میں بیٹھے لوگ کثرت سے قرآن شریف پڑھتے ہیں کبھی کبھی تو اذان میں دو منٹ کا وقت ہوتا ہے پھر بھی آنے والا ایک قرآن اٹھاتا ہے، لے کر بیٹھتا ہے، صفحہ کھولتا ہے اور دو چار آئتیں ہی پڑھ پاتا ہے پھر رکھ دیتا ہے۔ میں نے یہاں بسوں اور ٹیکسیوں میں بھی ڈرائیور کے پاس چھوٹے چھوٹے قرآن دیکھے جن کو وہ دس بیس منٹ کا وقت ملتے ہی کھول لیتے ہیں۔ ثواب کی بات اپنی جگہ ہے، قرآن کریم تو زبان وادب کا اعلیٰ ترین معیار بھی ہے۔ جس کی زبان عربی ہو اسے اس سے زیادہ کس کتاب میں لطف آئے گا؟

منیٰ کی پہلی رات

عزیزیہ میں چوتھا دن تھا۔ہم تمام لوگوں کوکل منیٰ کی روانگی کا اشتیاق تھا۔عمرہ سے فارغ ہو چکے تھے لیکن حج کے ارکان ابھی شروع نہیں ہوئے تھے۔سب کو معلوم تھا کہ منیٰ میں کل ظہر سے لے کر پرسوں فجر تک کا وقت گذارنا ہے اس لیے کل فجر کے فوراً بعد روانہ ہونا چاہئے۔سب کو پریشانی تھی کہ کہیں جدہ کی طرح بس کے آنے میں تاخیر ہوئی تو کیا ہوگا۔اسی ادھیڑ بن میں شام کے وقت نفیس صاحب کا اعلان ہوا۔

''بھئی،معلم کے یہاں سے خبر آئی ہے۔بس رات میں ہی آئے گی اور رات میں ہی جانا ہے۔آپ تمام حضرات رات کے کھانے سے جلد فارغ ہوجائیں۔غسل،وضووغیرہ کرلیں۔دورکعت تحیتہ الاحرام پڑھ کراحرام پہن لیں اورسو جائیں۔جس وقت بس آئے گی میں اعلان کردوں گا''

بحث شروع ہوگئی— فجر سے قبل جانا ترک سنت ہے— معلم سے کہا جائے کہ وہ فجر کے بعد بس بھیجے —اس سے تو بہتر تھا کہ آٹھ دس کلومیٹر ہم پیدل ہی چل لیں — کل صبح فجر بعد روانہ ہوں اور گھنٹے دو گھنٹے میں وہاں پہنچ جائیں اس طرح حج میں کوئی خرابی نہیں آئے گی— بس آجائے تو اسے روک لیا جائے اور فجر بعد یہاں سے چلا جائے—وغیرہ وغیرہ۔

برادرم سراج اجملی نے علی گڑھ سے فون کیا۔میں نے صورتحال بتائی تو انکا بھی یہی مشورہ تھا کہ کسی طرح تاخیر کر کے فجر کا وقت نکال لیا جائے۔شاید اس پرعمل بھی ہو جاتا لیکن بس بارہ بجے کے آس پاس آگئی۔ہم سب سو چکے تھے جلدی جلدی اٹھے۔باتھ روم پر قبضہ کرنے کی

کوشش شروع ہوئی وضو کرنے میں بھی آدھے گھنٹے زیادہ انتظار کرنا پڑا۔ساڑھے بارہ بجے سے لوگ نیچے آنے لگے۔سب کا اتفاق ایک بات پر ہو گیا کہ ـــــ چلو کچھ پہلے ہی جا رہے ہیں، بس کل دوپہر میں آتی تو ہم وہاں ظہر سے پہلے کیسے پہنچتے ؟

لوگوں کے سامان دیکھ دیکھ کر وحشت ہو رہی تھی۔نفیس صاحب ناشتے کے بعد فضائل حج سنا کر یہ بتا چکے تھے کہ صرف ایک فاضل احرام، مصلٰی اور ایک جوڑا کپڑا رکھ لیں جو احرام کھولنے کے بعد پہنا جا سکے۔لوگوں نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ بڑے بڑے بیگ اور سوٹ کیس برامد ہو رہے تھے۔بس کی چھت بھی سپاٹ تھی ایسا کچھ نہیں تھا کہ سامان وہاں بندھوایا جائے۔دو بسیں، سو لوگوں کی گنجائش، ایک سو سترہ آدمی، اوپر سے یہ سامان۔بہر حال کسی طرح سوار ہوئے۔دوری تو زیادہ نہیں پھر بھی گاڑیوں کی اتنی لمبی قطار تھی کہ بس چلتی کم تھی رکتی زیادہ تھی۔دو گھنٹے سے زیادہ کا وقت لگا تب جا کر بس ایک خیمے کے دروازے پر رُکی۔

بس کی کھڑکی سے تھورا بہت اندازہ ہو رہا تھا لیکن نیچے اترتے ہی ایک نئی دنیا سامنے تھی۔آگے پیچھے، دائیں بائیں ہر طرف تا حد نگاہ مستقل اور مضبوط آہنی ریلنگ سے گھرے ہوئے علاقوں میں الگ الگ معلم کے ایک جیسے سفید خیمے۔داخلے کے دروازے پر سخت پہرہ۔سب کے سب ہاتھ میں پہنا ہوا پٹا، گلے میں لٹکا شناختی کارڈ اور بطاقہ دکھا کر اندر داخل ہوئے۔بطاقہ وہ کارڈ ہے جو معلم پاسپورٹ کے عوض جاری کرتا ہے۔اتفاق سے چھبیس لوگوں کا بطاقہ نہیں آیا تھا۔ان میں میں بھی تھا۔گیٹ پر تھوڑی افراتفری ہوئی۔تبھی عتیق بھائی نے ان سے عربی میں گٹ پٹ کی۔ان کا نیٹ ورک بہت مضبوط ہے۔فوراً ایک نے فون لگا کر کسی سے بات کی اور کہا ـــــ ''ہاں، چھبیس لوگ بغیر بطاقہ والے ہیں، یہ بھی جائیں گے۔ان کا بطاقہ پیچھے سے آجائے گا۔صرف منٰی میں ٹھہرنے والا کارڈ اور ہاتھ کا پٹا دیکھ لو۔''

اندر داخل ہوئے معلم نمبر 88 کے خیموں میں خیمہ نمبر 12 اور 13 ہمیں ملا۔ 13 عورتوں کو دیا گیا، 12 پر ہم قابض ہوئے۔ دن میں ہی نفیس صاحب نے کہا تھا کہ اس سال معلم گدا، تکیہ اور کمبل بھی دے رہا ہے۔ اندر آ کر گدے، تکیے اور کمبل پر ہنسی آئی۔ فرش پر ریت کو برابر کر کے اس پر سستی قالینیں ڈال دی گئی تھیں۔ اس پر کوئی ہاتھ بھر چوڑے تھیلے نما گدے تھے اور ویسے ہی چھوٹے چھوٹے تکیے۔ ایک قدرے موٹی چادر نما چیز تھی جس کے لیے کئی دن قبل سے ہی بلانکٹ اور کمبل کے الفاظ استعمال ہو رہے تھے۔ سب ایک ہی رنگ کے میل خورے، خاکی۔ نفیس صاحب نے چٹکی لی — "یہ عیش بھی پہلی بار نصیب ہوا ہے۔ پہلے تو ہمیشہ صرف پتلے دری نما قالین ہی بچھے ملے ہیں۔"

جو لوگ پہلے بھی حج کر چکے تھے انہوں نے بھی انکی تصدیق کی۔ سب نے اپنی اپنی پسند کے لوگوں کے آس پاس کے گدوں پر قبضہ شروع کیا۔ عزیزیہ میں ہم لوگ ایک کمرے میں پانچ آدمی تھے۔ ان میں سے چار ایک کونے پر اکٹھے ہو گئے۔ میں نے ایک بیڈ پر اپنا چھوٹا سا بیگ سرہانے رکھا اور لیٹ گیا۔ اس کے بعد بحث شروع ہوئی کہ اس گدے کا سائز کیا ہے۔ لمبائی تو 6 فٹ سب نے مان لی لیکن چوڑائی میں اختلاف تھا۔ کوئی ڈیڑھ فٹ کہتا کوئی دو فٹ۔ بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ یہ پونے دو فٹ ہے۔ اس پر سونا ایک چوڑے بنچ پر سونے کے مترادف تھا۔ اس پر آپ کسی طرح کروٹ لیں دوسرے کے بدن میں ٹھوکر لگنی ہی تھی۔ لیکن اس خیمے میں 60 لوگوں کے لیے اور کوئی صورت بھی نہیں تھی۔ تھوڑی بہت چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ لیکن ایک آواز نے سب کو پانی کر دیا —

"حضرات، ہم لوگ یہاں آرام کرنے اور سونے نہیں آئے ہیں۔ یہ تو صرف کمر ٹکانے کے لیے ہے۔ کل کا دن اور رات آپ تسبیح و تہلیل اور دعا میں گذاریں گے، گریہ وزاری میں گذاریں گے، جس کے لیے اتنی جگہ کافی ہے۔"

مفتی صاحب کی اس بات کے بعد یہ بھی طے ہوا کہ نمازیں خیمے میں ہی پڑھی جائیں گی۔ فجر کی اذان یہیں سوا پانچ میں دی جائے گی اور نماز پونے چھ بجے ہوگی۔ تین بجے کے بعد لوگ سوئے تھے اور چار بجے کے بعد سے ہی اذان کی آوازیں آنی شروع ہوگئیں۔ لیکن آس پاس کے خیموں میں بنگلہ دیش اور افغانستان کے لوگ ٹھہرے تھے۔ ان خیموں میں تقریباً ہمارے ہی وقت سے اذان اور نماز ہوئی۔

فجر کی نماز کے بعد مفتی صاحب نے کئی باتوں کی وضاحت کر دی۔۔۔

''یہاں صبح صادق سے ہی فجر کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ احناف کے نزدیک صبح صادق کے گھنٹہ بھر بعد فجر کا وقت ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں فجر کی نماز اسفار میں مستحب ہے۔ یعنی جب ہلکا اجالا ہو جائے۔ اس لیے ہم اپنی اذان اور اپنی جماعت کریں گے۔''

مفتی صاحب دیوبند کے فارغ ہیں اور مادری زبان آسامی ہونے کے باوجود اردو صاف ستھری بولتے ہیں۔ ہر بات کی سند کے طور پر آیات اور احادیث برمحل پیش کرنے پر قادر ہیں۔ سادگی اور انکساری کے باوجود شخصیت میں وزن ہے۔ اس لیے سوائے دو تین سرگوشیوں کے کوئی آواز بلند نہیں ہوئی۔ انہوں نے وقوف منیٰ سے متعلق فضائل و مسائل بیان کیے۔ یہاں کے لیے مسنون اور مستحب تسبیحات اور وظائف بتائے اور ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی کی۔۔۔

''یہاں مسجد خیف ہے اور عرفات میں مسجد نمرہ ہے ہم وہاں جائیں اور موقع ہو تو نفل بھی پڑھیں لیکن فرائض کی ادائیگی سے پرہیز کریں۔ یہاں ایام حج میں حکومت کی طرف سے جو امام بھیجے جاتے ہیں وہ یہاں قصر کرتے ہیں۔ ہم نے مکہ میں پندرہ دن سے زیادہ رہنے کی نیت کی ہے اس لیے ہم مقیم

ہیں۔ یہ جگہ اب مکہ کے ہی حکم میں داخل ہے۔ فاصلہ بھی زیادہ نہیں اس لیے قصر کی کوئی گنجائش نہیں۔ حضور ﷺ نے چونکہ مدینہ سے آ کر حج کیا تھا اس لیے انہوں نے یہاں قصر کیا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے مدینہ سے آنے کے باوجود حج کے دوران یہاں قصر نہیں کیا کیونکہ مکہ میں انکا مکان تھا اور جائداد بھی تھی۔ ہم بھی یہاں پوری نماز پڑھیں گے اس لیے اپنے خیمہ میں ہی پڑھنا مناسب ہے۔"

صبح ہوتے ہی ایک اور مسئلہ سامنے آیا۔ ہمارا خیمہ جہاں تھا اس کے نزدیک ہی ایک اسپتال ہے۔ المستشفیٰ منیٰ الوادی یعنی Mina-Al-Wadi Hospital اس کے ایک طرف بورڈ لگا ہے۔ البدایة المنی (MINA BEGINS HERE) اور دوسری طرف ہے النھایة المنیٰ (MINA ENDS HERE) اسی بورڈ کے پیچھے لکھا تھا البدایة المزدلفه (MUZDALIFA BEGINS HERE) موٹے طور پر منیٰ کی سرحد ہمارے خیمہ سے 250 میٹر کی دوری پر تھی گویا ہمارے خیموں کا پورا علاقہ اس اعتبار سے منیٰ سے باہر تھا۔ یہ مسئلہ بھی خیمہ میں زیرِ بحث آیا۔ مفتی صاحب بھی خیمہ کو منیٰ میں نہیں مان رہے تھے۔ نفیس اور عتیق صاحبان نے وضاحت کی کہ حجاج کی تعداد بڑھنے سے جگہ کی کمی ہوگئی ہے اور حکومت نے اب اس علاقے کو بھی منیٰ میں داخل کر لیا ہے اور یہاں خیمے حکومت نے ہی لگوائے ہیں۔ پھر بھی بہت سے لوگوں کی تشفی نہ ہوئی۔ بات یہاں آ کر رکی کہ منیٰ میں تھوڑی دیر ٹھہرنا بھی ضروری ہے اور ہر شخص یہاں کے قیام کی مدت میں کسی نہ کسی ضرورت سے منیٰ کے علاقے میں ضرور جائے گا اور یوں وقوف منیٰ کے مسئلے پر بھی عمل ہو جائے گا۔

وہ خیموں کی دنیا

میں صبح سویرے ہی منیٰ میں دو تین کلومیٹر تک چلا گیا تھا۔ وہاں موجود ایک نئی مسجد میں دو رکعت نفل بھی پڑھی۔ بعد میں معلوم ہوا یہ کویتی مسجد کہلاتی ہے۔ دل میں یہ اطمینان ہوا کہ میں نے کچھ نہ کچھ وقت منیٰ میں ضرور گذارا ہے۔ لیکن منیٰ میں رات کا کچھ حصہ گذارنا ضروری ہے۔ زیادہ تر لوگ تو خیموں میں رہے۔ میں اور میرے ساتھ ایک اور حاجی شیخ ایوب علی عصر کے بعد ہی نکل گئے۔ پھر اسی مسجد تک گئے مغرب وہیں پڑھی۔ پاس ہی رضوان کریمی کا خیمہ تھا یعنی بہار حج کمیٹی کے معلم نمبر 50 کا خیمہ۔ فون کر کے انہیں باہر بلایا، ملاقات ہوگئی۔ وہیں حافظ نشاط اور نور عین صاحب بھی مل گئے۔ اس بڑے مجمع میں کسی کو تلاش کرنا اور اس کا مل جانا امر محال ہے۔ شمیم منعمی صاحب کا خیمہ نمبر 9 تھا میں 10 تک پہنچ جانے کے باوجود 9 نہیں تلاش کر پایا۔

خیموں کی دنیا بھی عجیب ہے۔ فرش پر لگے ہوئے بستر، جھولتے ہوئے دروازے، لوہے کے فریم پر تنی ہوئی ترپال نما سفید مٹیریل کی چھت اور دیواریں۔ بیچ میں چھاتے یا چمنی نما سرپوش۔ اندر ایر کنڈیشننگ کا نظام۔ اندر اور باہر کے درجہ حرارت میں کم از کم بیس ڈگری کا فرق۔ نومبر کا مہینہ ہونے کے باوجود دس بجے دن میں کھلے آسمان کے نیچے آدھا گھنٹہ گذارنا مشکل۔۔ پردہ نما دروازہ ذرا سا کھلا رہ جائے اور دھوپ کی ایک لکیر جسم پر تھوڑی دیر ٹھہری رہے تو سویا ہوا آدمی جاگ جائے۔

ہر چار ٹینٹ کے بیچ میں ایک بیت الخلا کا کمپلیکس جس میں دس ٹائلٹ زنانہ اور دس مردانہ۔ وضو کے لیے آٹھ نل۔ لیکن بھیڑ کا عالم یہ کہ دو گھنٹے میں بھی تمام لوگوں کا فارغ ہو پانا

ناممکن۔ کمزور معدہ اور مثانہ والوں کے لیے سخت امتحان کی جگہ۔ ہر ٹائلٹ کے باہر آٹھ دس لوگ لائین میں کھڑے ہوئے۔ اسی میں کوئی چھوٹے استنجے کے لیے گیا تو جلدی باہر آ گیا۔ کوئی بڑے استنجے کے لیے گیا تو دس پندرہ منٹ کی فرصت۔ اسی میں اوپر بھی پائپ لگا ہے تاکہ کوئی نہانا چاہے تو نہا بھی لے۔ ایک پتلا سا ربر کا پائپ لگا ہوتا ہے جس سے طہارت کے لیے پانی برآمد ہوتا ہے۔ اوپر کے شاور اور نیچے کے نل کے لیے ایک ہی ہینڈل۔ اگر الٹی طرف گھما دیا تو اوپر سے سر پر پانی کی دھار گرنے لگی۔ صحیح گھمایا لیکن جھٹکے سے اور تیز گھما دیا تو پانی کی تیز دھار سے کپڑے شرابور، گندے فرش سے اڑ کر بدن پر چھینٹے پڑے وہ الگ۔ بقول شخصے ـــ 'اس باتھ روم سے پاک ہو کر نکلنا خواب وخیال ہے۔' کوئی دوسرا متبادل بھی نہیں۔ ساری نفاست اور ساری امارت کا جنازہ دیکھتے ہی دیکھتے نکل جاتا ہے۔ لوگ پہلے تو اس پورے نظام کی تنقید کرتے ہیں، حکومت اور معلم کو ان کی بے توجہی پر کوستے ہیں، پھر چار چھ گھنٹے میں اس نظام کا حصہ ہو جاتے ہیں۔

احرام باندھے ہوئے ایک ہی حلیے کے سیکڑوں لوگ ایک ہی طرح سے ٹائلٹ کے دروازے پر لائن لگائے، بلکہ دروازے کو چھیکے ہوئے تاکہ کسی دوسری لائن والا شخص موقع دیکھ کر گھس نہ جائے، نفسی نفسی کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ سمجھدار لوگ کم اور زیادہ بھیڑ کے اوقات کا اندازہ کر لیتے ہیں۔ اور اسی کے مطابق اپنی روٹین طے کر لیتے ہیں۔ جو لوگ حوائج ضروریہ کو دو چار گھنٹے تک روکنے کی قدرت رکھتے ہیں یا دیر تک وضو بچائے رکھتے ہیں وہ یہاں خاصے آرام سے رہتے ہیں۔ اکثر ایک ایسے نل سے بیک وقت آٹھ دس لوگ وضو کر رہے ہوتے ہیں جس سے پانی پوری رفتار سے باہر آتا ہے، اس کی دھار کے سامنے کئی ہاتھ پھیلے ہوتے ہیں، سب کو جلدی ہوتی ہے، کوئی کسی کے لیے اپنی جگہ نہیں چھوڑتا، کسی کے پھیلے ہوئے ہاتھ میں پانی کی پوری مقدار نہیں پہنچتی۔ جو وضو ایک منٹ میں ہو سکتا ہے اس کے لیے پندرہ منٹ لگتے ہیں۔

چار خیموں کے بیچ میں ایک بلاک باورچی خانہ کے لیے ہے۔ چار بڑے بڑے گیس کے چولھے اوران کے اوپر لگی ایگزاسٹ چمنی۔ چولھے اور چمنی دونوں کے بیک وقت چلنے کی مہیب آواز۔ خاص بات یہ ہے کہ ان چولھوں میں سلنڈر نہیں لگتے۔ گیس کی سپلائی پائپ لائن کے ذریعہ حکومت کی طرف سے ہوتی ہے۔ تیز ہوا چلتے وقت یا کسی امکانی خطرے کے پیش نظر گیس کی سپلائی روک دی جاتی ہے اور آپ دوبارہ اس کے جاری ہونے کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ اس کا کوئی وقت نہیں۔ چونکہ پہلے بھی منیٰ میں گیس سلنڈر کی وجہ سے ہی آگ لگنے کا حادثہ ہو چکا ہے اس لیے اس احتیاط کی وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے۔

چونکہ یہ تمام خیمے ٹور اینڈ ٹریولس والوں کے تھے اس لیے سب کے ساتھ اپنے باورچی اور اپنے ساز و سامان تھے۔ بڑی پارٹیاں معلم کے کارکنوں کو کھلا پلا کر پہلے ہی اچھے خیمے اور کچن میں زیادہ جگہ پر قابض ہو جاتی ہیں۔ عموماً جو پہلے آتے ہیں وہ زیادہ فائدے میں رہتے ہیں۔ بعد میں آنے والوں کو ان کے ساتھ 'ایڈجسٹ' کرنا پڑتا ہے۔ نفیس صاحب معاملہ فہم انسان ہیں پہلے ہی کہہ دیا تھا ——

''میں اپنا ساز و سامان لے کر چل رہا ہوں وہاں بھی آپ کو چائے، ناشتہ، کھانا سب دینے کی کوشش کروں گا۔ لیکن حالات موافق نہ ہوئے تو میں مجبور ہو جاؤں گا۔ مجبوراً بسکٹ اور نمکین وغیرہ پر گزارا کرنا پڑے گا۔ میں یہ بھی ساتھ لے کر چل رہا ہوں۔ اگر بہت عمدہ کھانا نہ بن پایا تو کم از کم کھچڑی بنوا کر ہی کھلانے کی کوشش کروں گا۔''

کئی دن سے مسلسل گوشت خوری کر رہے اکثر لوگوں کے چہرے پر کھچڑی کے ذکر نے ہی ایک خوشگوار کیفیت پیدا کر دی۔ بہر حال ایک چولھے پر تو قبضہ ہو ہی چکا تھا۔ صبح میں انڈا بھی

ابلا اور چائے بھی بنی۔ دن میں سبزی ڈال کر بنائی ہوئی کھچڑی تھی، جسے تکلفاً 'وتیج بریانی' کہنے کا رواج ہے۔ رات میں روٹی اور سالن بھی دستیاب ہوگیا۔

لوگ عام طور پر نمازوں اور وردووظائف میں مشغول رہے۔ ہم جیسے لوگ رات کی نیند پوری کرنے کے لیے سوئے بھی۔ کچھ لوگ حسب معمول باواز بلند اپنی روزمرہ کی گفتگو میں مشغول رہے یا حالات پر رواں تبصرہ فرماتے رہے۔ یہاں ظہر سے فجر تک پانچ وقت کی نمازیں پڑھنا سنت ہے لیکن رات کے کھانے کے بعد خبر دی گئی کہ دو تین گھنٹے میں بس آجائے گی اور رات میں ہی عرفات کے لیے کوچ کرجانا ہے۔ پھر وہی مسئلہ، پھر وہی بحثیں۔ پھر پیدل ہی چلنے کے مشورے لیکن بھٹک جانے اور اپنے خیمے تک پہنچ نہ پانے کا خطرہ مجبور کررہا تھا کہ معلم جیسے لے جائے ویسے ہی جایا جائے۔ ہم آخر اپنی مرضی کے مالک تو ہیں نہیں۔ کسی حادثے کی صورت میں ان کا رویہ ایسے لوگوں کے ساتھ اچھا نہیں ہوتا جو ان کی ہدایات پر عمل نہ کریں۔ بہرحال رات کے ایک بجے منیٰ سے عرفات پہنچے۔ آج کی رات بس نسبتاً تیز چلی تھی۔ دس گیارہ کلومیٹر کا راستہ گھنٹہ بھر میں طے ہوگیا تھا۔

فی سبیل اللہ

عرفات میں فجر کے بعد سے مغرب کا وقت ہونے تک ٹھہرنا سنت ہے۔ ہم تو تہجد کے وقت ہی پہنچ گئے تھے۔ 'مردہ بدستِ زندہ' کی طرح 'حاجی بدستِ معلم' کا معاملہ ہوتا ہے۔ یہاں بھی معلمین نے خیمے لگائے تھے لیکن منیٰ کی طرح نہیں۔ یہ کپڑے کے شامیانے کی طرح کے، اور بیچ سے اونچا کیے ہوئے، معمولی تنبو تھے۔ زمین بھی ٹھیک سے برابر نہیں کی گئی تھی۔ اونچی نیچی ناہموار سطح پر قالین ڈال کر فرش بنادیا گیا تھا۔ ایک چاروں طرف سے کھلا ہوا شامیانہ، نہ بلب، نہ پنکھا، نہ اے سی۔ ہاں بیت الخلا اور وضو کے لیے باضابطہ انتظام کیا گیا تھا، اور وہاں خاصی روشنی بھی تھی۔ بلکہ اسی کے عکس سے خیموں میں تھوڑا بہت اجالا تھا۔ دراصل یہاں تو صرف دن بھر کا قیام ہے جس کے لیے روشنی وغیرہ کی ضرورت نہیں، لیکن ہم وقت سے قبل لے آئے گئے تھے اس لیے ہر شے میں کسی شے کی کمی پا رہے تھے۔

ہمارا شامیانہ اتنا بڑا ضرور تھا کہ ہمارا پورا گروپ اور ہم سے کچھ چھوٹا افغانیوں کا ایک گروپ اس میں آرام سے لیٹ گیا پھر بھی خاصی جگہ خالی تھی۔ زیادہ تر لوگوں نے اپنی اپنی چادریں قالین کے اوپر بچھالیں۔ اس کا ایک مقصد اتنے حصے پر اپنا قبضہ ثابت کرنا بھی تھا۔ میں جہاں اپنا بیگ رکھ کر لیٹا وہاں دو تنبوؤں کا جوڑ تھا۔ دونوں کے سروں میں فاصلہ ہونے کی وجہ سے ایک ڈیڑھ فٹ چوڑی جگہ خالی تھی اور میں دعویٰ کرسکتا تھا کہ کھلے آسمان کے نیچے رہا۔

فجر کی اذان اور نماز منیٰ کی ہی طرح خیمے میں ادا ہوئی۔ ابھی امام دوسری رکعت میں تھے کہ پاس کے خیمے سے دعا کے بعد صلوٰۃ وسلام شروع ہوگیا۔ لہجہ سے اہلِ بنگال لگتے تھے۔ شاید

بنگلہ دیسیوں کا جتھا تھا۔ 'یا نبی سلام علیک' اور' مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام' دونوں جس لحن اوور دل سوزی سے ادا کیے جارہے تھے اس کا اثر دل پہ نہ ہونا ناممکن تھا۔ حالانکہ آواز بغیر مائک کے تھی اور ہلکی تھی اور ادھر بھی قرأت ہورہی تھی اس کے باوجود لوگ آبدیدہ تھے۔

فجر کے بعد سے ہی لوگ اپنے اپنے معمولات، یا خصوصی وظائف، یا تلاوت یا دعا میں مصروف ہوگئے۔ کئی جانکار لوگ سویرے ہی مسجد نمرہ کی طرف چلے گئے تھے۔نو بجے کے آس پاس میں نے بھی جانے کی خواہش کا اظہار کیا تو چار لوگ اور تیار ہوگئے۔ ہر جانکاری کو حاصل کرنے کے شائق لسکر صاحب، سدا بہار صابر بھائی، ذوالنورین صدیقی اور امین احمد۔ان میں ذوالنورین صدیقی سب سے بزرگ لیکن مضبوط قد کاٹھی کے تھے۔ امین احمد گرچہ رٹائر ہوچکے تھے لیکن ہلکے پھلکے اور پھرتیلے تھے۔ خیال تھا کہ ایک ڈیڑھ کلو میٹر پیدل چلنا ہوگا کیونکہ لوگوں نے کچھ ایسا ہی نقشہ پیش کیا تھا۔ہم پوچھتے پوچھتے آگے بڑھتے چلے گئے۔ دھوپ لحظہ بہ لحظہ تیز ہوتی جارہی تھی۔

تقریباً چار کلو میٹر چلنے کے بعد ہم عرفات کے میٹرو ریلوے اسٹیشن پر پہنچے جہاں ایک میٹرو ٹرین ابھی آکر رکی تھی اور اس سے خاصے لوگ اتر کر باہر آرہے تھے۔ یہاں ریلوے کا یہ انتظام ابھی بالکل نیا ہے اور یہ ٹرینیں کچھ ہی دنوں سے چل رہی ہیں، غالباً تجرباتی طور پر۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ ابھی صرف سعودی لوگوں کے لیے ہی اس میں سفر کرنے کی اجازت ہے اور کرایہ بہت زیادہ ہے۔لیکن دوسرے ہی دن ہمارے گروپ کے ایک ساتھی نے بتایا کہ ایسی کوئی پابندی نہیں اور کوئی کرایہ بھی نہیں ہے۔ یہ حج کے دوران مفت چلائی گئی ہے۔منیٰ، مزدلفہ، عرفات سب جگہ اسٹیشن ہے۔ٹرین پر سوار ہونے کا موقع نہیں مل سکا اس لیے دونوں میں سے کسی بات کی تصدیق نہ ہوسکی۔

عرفات اسٹیشن سے کچھ قبل ہی سے مسجد نمرہ کے تصویروں میں دیکھے ہوئے مینار دکھائی دے گئے تھے اور ہم اسی اندازے پر بڑھ رہے تھے لیکن اسٹیشن کے بعد بھی ایک ڈیڑھ کلو میٹر کی دوری طے کر کے ہم مسجد نمرہ کے سامنے پہنچے۔ یہاں سے مسجد کی دوری بمشکل 500 میٹر رہی ہوگی۔ لیکن یہ مختصر دوری سب سے سخت ثابت ہوئی۔ ہجوم اس قدر بڑھ گیا تھا کہ چلنا تو دور پانچ لوگوں کا ساتھ ساتھ کھڑے رہنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ کسی طرح آدھی دوری اور طے ہوئی لیکن تب تک ادھر سے لوٹنے والوں کا ریلا شروع ہو گیا تھا۔ معلوم ہوا کہ مسجد میں داخلہ کے دروازے بند کر دیے گئے ہیں۔ گویا ادھر گنجائش سے زیادہ لوگ پہنچ چکے ہیں۔ مسجد کی سامنے کی دیوار کے اوپری حصے پر لال رنگ کا الکٹرانک سگنل ایک دائرے میں بنی ہتھیلی پر ضرب کا سرخ نشان دکھا رہا تھا۔ جس کا مطلب صاف تھا کہ داخلہ ممنوع ہے، ادھر مت آؤ۔ مایوسی تو ہوئی لیکن لوٹنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کیوں کہ اب تک باہر کی ایک ایک انچ زمین پر بھی مصلے بچھ چکے تھے۔ سڑک پر بھی دونوں طرف سے صفیں لگنی شروع ہو گئی تھیں۔ مجبوراً ہمیں پیچھے ہٹنا ہی پڑا۔

یہاں آتے اور یہاں سے لوٹتے ہوئے سب سے دلچسپ چیز ہے سبیل، یعنی سامانوں کی فی سبیل اللہ تقسیم۔ مفت کا مال حاصل کرنے کے لیے بھیڑ میں گھسنا اور چھینا جھپٹی کے بعد اسے حاصل کرنا میرے مزاج کے خلاف ہے۔ میں عموماً ایسے مواقع پر تماشائی بنے رہنے میں زیادہ لطف محسوس کرتا ہوں۔ یہاں سڑکوں کے کنارے پانی کی بوتلیں، جوس اور شربت کے کاغذی یا پولی پیک، پیپسی اور کوکا کولا کے کین، آئس کریم کے کپ، لبـــن یعنی دہی کی بوتلیں، سنترے، سیب، کیلے، ٹافیاں، بسکٹ کے پیکٹ، چھتریاں اور کیا کیا نہیں تقسیم ہو رہا تھا۔ موبائل کی کمپنیاں اپنے اسٹال سے ہلکی پھلکی چھتریاں بانٹ رہی تھیں۔ سب سے حیرت تو تب ہوئی جب ایک بڑی وین کے پاس کھڑے شخص کو بریانی تقسیم کرتے دیکھا۔ یہ شخص ایک پلاسٹک کی

اچھی خاصی سینی میں اتنا چاول دیتا تھا جس میں ہم جیسے آٹھ لوگ کھالیں۔ ہاں، چاول کے اوپر خاصے بڑے سائز کا ایک مسلم مرغ بھی رکھا ہوا ہوتا تھا۔

میں نے گرچہ سبیل میں کوئی دلچسپی نہ دکھائی پھر بھی گلا خشک تھا اور جسم پسینے سے تر تھا۔اس لیے اگر کسی نے ہاتھ میں پانی یا جوس کی بوتل پکڑا دی تو انکار کرنا مشکل ہوگیا۔ پھر یہ بھی کہ وہ اس محبت، انکساری اور مہمان نوازی کے جذبے کے ساتھ، چہرے پر مسکراہٹ کا نور بکھیرے یہ سبیل پیش کرتے ہیں کہ انکار کرتے وقت محسوس ہوگا گویا کوئی گناہ کر رہے ہیں۔ وہاں سے لوٹتے ہوئے ہمارے ہاتھوں میں لٹکے پالی تھین کے تھیلوں میں اور کسی کسی کے احرام کی چادر میں گٹھر کی شکل میں بندھا ہوا اتنا سامان تھا کہ خیمے میں بیٹھے لوگوں کے درمیان فراخدلی سے بانٹ دیا گیا۔ ایک ہمراہی کا تبصرہ تھا کہ 'اگر ٹریکٹر لے کے گئے ہوتے تو وہ بھی بھر جاتا۔' ویسے ایک بات ہے کہ دس کلومیٹر سے زیادہ پیدل چلنے کے دوران ہم نے کہیں کوئی دکان نہیں دیکھی۔ اگر کوئی کچھ خرید کر کھانا چاہے بھی تو نہیں کھا سکتا۔ جو بھی ہے فی سبیل اللہ ہے۔

عرفات کا ایک دن

عرفات کے جس علاقے میں ہمارے خیمے لگائے گئے تھے وہ تھا تو ریتیلا لیکن یہ ویسی موٹی ریت نہیں تھی جیسی دیوار بنانے میں سمنٹ کے ساتھ ملاتے ہیں بلکہ یہ مٹی سے مشابہ تھی۔ ممکن ہے یہاں کہیں سے مٹی بھی لا کر ڈالی گئی ہو۔ اچھے خاصے علاقے میں شجر کاری کی گئی ہے۔ ہمارا خیمہ جس جگہ لگا تھا وہاں سے دو کلومیٹر آگے تک نیم جیسے درخت دکھائی دیے جن کی عمر دو تین سال سے زیادہ نہیں لگتی۔ ہر پیڑ کے پاس ایک ربر کی نلکی زمین سے باہر نکلی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ یقیناً اس کا تعلق کسی زیر زمین پائپ سے ہوگا اور کہیں ایک جگہ سے پانی کی سپلائی دے دینے پر ہر جگہ آبپاشی ہو جاتی ہوگی۔ میں نے سوچا کہ یہی کام اگر اپنے یہاں کرنا ہو تو کم از پانچ سو لوگ بالٹی وغیرہ کے ساتھ لگانے پڑتے۔ ان کے اوپر بہت سے سپروائزر اور ان کے اوپر کئی افسر اور ان کے اوپر ایک افسر اعلیٰ کو لگانا پڑتا۔ پھر بھی پانی ان پودوں تک پہنچتا اس کی گارنٹی مشکل تھی۔ ایک ربر کے پائپ نے کتنے لوگوں کی چھٹی کر دی۔

عرفات میں کھانا پکانے کا کوئی نظم نہیں۔ کہیں کچن نہیں۔ اس دن سب کے لیے کھانا سرکاری مد سے آتا ہے۔ ہر حاجی کو وہ خواہ کسی ملک کی حج کمیٹی کے توسط سے آیا ہو یا کسی ٹریول ایجنسی کے ذریعہ، اس کا تعلق جس معلم یا مطوّف سے ہوگا وہی اس کے دن کے کھانے کی فکر کرے گا۔ ایک معلم کے ذمے اوسطاً چار سے پانچ ہزار حاجی ہوتے ہیں۔ وہ ان کے لیے اپنے اسٹاف سے کھانا بھجواتا ہے اور پینے کے پانی کی فراہمی کراتا ہے۔ ہمارے خیمے میں بھی 117 لوگوں کے لیے مٹن بریانی کا پارسل پہنچ گیا۔ ایک دلچسپ بات یہ تھی کہ ہماری دونوں ایجنسی کے مالکان یعنی نفیس صاحب و عتیق

صاحب بھی احرام میں تھے اور دونوں باورچی بھی احرام میں ہی تھے۔ ایک دن تو ان کو آرام ملا۔ ورنہ وہ تو اپنے ارکان بھی ادا کرتے رہے اور سب کے چائے ناشتہ اور کھانے کی بھی فکر کرتے رہے۔

ہم مسجد نمرہ میں جگہ حاصل نہیں کر پائے اور خطبہ سنے بغیر لوٹ آئے۔ لیکن خیمہ میں بیٹھے بیٹھے احساس ہوا کہ خطبہ جیسی آواز خیمہ کے باہر سے آ رہی ہے۔ دیکھا تو کچھ مقامی لوگ پوری آواز میں غالباً ایف.ام. ریڈیو بجا رہے تھے اور اس پر خطبہ براہ راست نشر ہو رہا تھا۔ کسی نے کہا کہ حرم شریف کی ہر وقت کی نماز بھی نشر ہوتی ہے اور حرم کے آس پاس کے دکاندار اپنی دکانوں کے پاس ہی صف بنا کر نماز پڑھتے ہیں اور ریڈیو آن کر لیتے ہیں۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمْ!

دن منیٰ کی بہ نسبت زیادہ گرم لگا کیونکہ سر پر صرف کپڑے کا سائبان تھا لیکن ہلکی سی ہوا چلنے پر فرحت محسوس ہوتی تھی۔ لوگ نماز، تلاوت اور وظائف میں مصروف تھے۔ کہیں کہیں چادریں لٹکا کر عورتوں کے لیے پردے کا انتظام بھی کر لیا تھا۔ آس پاس کے خیموں سے بھی کبھی پشتو کبھی بنگلہ اور کبھی اردو میں گریہ وزاری کے ساتھ دعا کرنے کی آوازیں آتیں اور ماحول کو بھگو جاتیں۔ کہتے ہیں اصل حج تو عرفات میں ٹھہرنا ہی ہے۔ روایات کے مطابق جنت سے زمین پر آنے کے بعد یہیں حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کی ملاقات ہوئی تھی اور دونوں نے ایک دوسرے کو پہچانا تھا۔ اسی مناسبت سے اسے عرفات یعنی پہچان کا میدان کہتے ہیں۔ ہر سال یہاں سارے حاجیوں کو ایک وقت میں جمع کرنے کی اصل مصلحت تو اللہ ہی جانے لیکن یہ وقفہ خود اپنی پہچان کے لیے بہت ہے ــــ لاکھوں کی بھیڑ میں ایک بے وقعت انسان، جس کی طرف دیکھنے کی کسی کو فرصت نہیں ــــ یہ بات یوں تو ہر لحظہ پیش نظر رکھنی چاہیے اور اسی کی روشنی میں اپنی زندگی کے خدوخال متعین کرنے چاہئیں لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو تو زندگی میں کم از کم ایک دن عرفات کے میدان میں اپنے بے بضاعت ہونے کا مشاہدہ اپنی آنکھ سے کیا جا سکتا ہے۔

یہاں مغرب کے وقت تک ٹھہرنا اور بغیر نماز پڑھے مزدلفہ کے لیے روانہ ہو جانا سنت ہے۔عصر کے بعد ہی ہنگامہ ہوا۔۔۔

''بس لگی ہوئی ہے، چلیے چلیے۔بس پر بیٹھیے''

پھر سب کے کھڑے ہوتے ہوتے معلوم ہوا کہ ایک ہی بس ملی ہے۔اسی پر سب کو سوار ہونا ہے لیکن یہ ناممکن تھا۔سیٹ سے زیادہ لوگ ایک بس میں بیٹھے۔پھر بھی تیس بتیس لوگ ابھی باہر تھے۔پتہ چلا کہ عتیق صاحب ایک اور بس کا انتظام کرنے معلم کے کارکنان کے پاس گئے ہیں۔یہاں پر سیکڑوں بسیں ایک دوسرے سے گتھی ہوئی آٹھ دس قطاروں میں کھڑی تھیں، ایک دوسرے کے بیچ بمشکل ڈیڑھ دو فٹ کا فاصلہ، ہزاروں لوگ ان میں چڑھنے یا اترنے میں مصروف اور ان سے کئی گنا زیادہ اپنی بس کی تلاش میں سرگرداں۔

تھوڑی دیر بعد ایک چھوٹی بس حاصل ہو جانے کا مژدہ لے کر عتیق صاحب آئے اور ہم منتظرین ان کے پیچھے پیچھے بسوں کے بیچ سے راستہ تلاشتے پر پیچ گلیوں کی طرح آگے بڑھتے دوسری بس کے پاس پہنچے۔تب تک یہاں دوسرا مورچہ بن چکا تھا۔معلم کے لوگوں نے یہی بس ایک افغانی جتھے کو بھی الاٹ کر دی تھی۔وہ لوگ مرنے مارنے پر آمادہ تھے لیکن اس بس سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھے۔گھنٹے بھر کی چخ چخ کے بعد بس کے دروازے ہم لوگوں کے لیے وا ہوئے اور ہم اندر جا کر بیٹھ گئے۔میں نے حسب معمول ضعیفوں کو ترجیح دی اور نتیجہ کے طور پر دو تین سیٹیں چھوڑنے کے بعد آخر کار ڈرائیور کے پاس جگہ پائی۔اس پورے ہائی ٹینشن ڈرامے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ بسیں مغرب کے وقت تک عرفات میں ہی رکی رہیں اور جب آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی مزدلفہ کی طرف بڑھیں تو سورج ڈھل چکا تھا۔

ماڈرن مرشد

اس بس میں، جواتنی فضیحت کے بعد حاصل ہوئی تھی اور جس کا ائرکنڈیشنر کام نہیں کر رہا تھا، ڈرائیور کے پاس انجن کی گرمی میں بیٹھ کر کچھوے کی سی رفتار سے سفر کرنا ایک ڈراونے خواب کی طرح ہی یاد رہتا اگر مرشد سے ملاقات نہ ہوتی۔

حج کے موقع پر ہزاروں بسیں دوسرے شہروں اور علاقوں سے بھی یہاں منگائی جاتی ہیں جن کے ڈرائیور یہاں کے مقامات سے واقف ہوں یہ ضروری نہیں۔ اسی لیے ہر بس میں ڈرائیور اور کلینر کے علاوہ ایک مقامی شخص بھی ہوتا ہے۔ یہی مقامی شخص مرشد کہلاتا ہے، بمعنی رشد دینے والا ـــ یعنی جو رستہ دکھائے۔ اس نوجوان لڑکے نے آگے بیٹھی ہوئی ایک بزرگ خاتون کو موبائل میں اپنے گھر والوں کی تصویریں دکھاتے ہوئے اردو میں مخاطب کیا تو میری دلچسپی (جس کے پاس بہت دیر سے کوئی کام نہیں تھا) اچانک جاگ گئی۔ پینٹ شرٹ میں ملبوس یہ نوجوان، نور محمد الیاس، دیر سے عربی میں ہی سارے معاملات نپٹا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کریدنے پر یہ حقیقت ابھر کر سامنے آئی کہ اس کے ماں باپ برما (موجودہ میانمار) سے برسوں پہلے یہاں وارد ہوئے اور غیر قانونی طور پر کسی طرح یہیں رہ گئے۔ یہ نوجوان یہیں پیدا ہوا اور اس نے برما کی شکل نہیں دیکھی ہے۔ مادری زبان برمی ہے اور تھوڑی بہت پڑھائی لکھائی جو بھی ہوئی عربی میں ہوئی۔ بچپن سے ہی عربی بول رہا ہے۔ پھر اردو کیسے آ گئی؟ سوال فطری تھا اور جواب غیر متوقع ـــ

"کیسے آ گئی کیا بولے۔ کہیں سیکھا تو نہیں ہے۔ فلم دیکھ دیکھ کے بولنا آ گیا ہے، بس بول رہے ہیں۔ اور کیا۔"

اس پچیس سالہ نوجوان نے بتایا کہ پچھلے آٹھ دس سال سے اس نے ہر مشہور ہندی فلم دیکھی ہے۔تمام فلمی ہیرو اور ہیروئنوں کے نام اور ان کی فلمیں اسے ازبر ہیں۔گانے گا نہیں سکتا لیکن گنگناتا ہے اور اس کے موبائل میں بہت سے ہندوستانی گانے موجود ہیں۔یہ بتاتے بتاتے اس نے پان پراگ کی ایک پڑیا پھاڑ کر منہ میں ڈال لی اور بس کا مصری ڈرائیور کچھ حیرت، کچھ تشویش، کچھ تجسس اور کچھ کراہیت سے اسے جگالی کرتے دیکھتا رہا۔

مغرب کے وقت سے کچھوے یا چیونٹی کی رفتار سے تھوڑی تیز چلتی ہوئی یہ بس دس بجے کے آس پاس ایک پل یعنی کوبری کے نزدیک رک گئی اور ڈرائیور نے یہیں اتر جانے کا نادرشاہی حکم صادر کر دیا۔عتیق اسی بس پر تھے انہوں نے اپنی عربی دانی کا بھرپور مظاہرہ کیا اور سمجھایا کہ انہیں جہاں جانا ہے وہ جگہ ابھی آگے ہے لیکن اس کے پاس ایک ہی جواب تھا۔۔۔

''مزدلفہ جانا تھا۔مزدلفہ آ گیا۔اب یہاں سے پیدل جدھر جانا ہے جاؤ۔''

جب آٹومیٹک دروازہ کھول دینے کے باوجود کوئی نیچے نہیں اترا تو گیٹ اور انجن دونوں بند کر کے ڈرائیور، کنڈکٹر اور مرشد تینوں اتر گئے۔بس کا ائر کنڈیشنر برائے نام چل رہا تھا اور راستے بھر ہم اس کی شکایت کرتے آئے تھے لیکن اس کی اہمیت تب سمجھ میں آئی جب انجن کے خاموش ہوتے ہی وہ ہوا کی تھوڑی سی آمدورفت بھی بند ہو گئی۔پانچ منٹ کے اندر ہی ایک شخص کو کھڑکی سے باہر کودنا پڑا اور خوشامد کر کے گیٹ کھلوانا پڑا تا کہ سب بس سے نیچے اتر سکیں۔

عتیق صاحب نے سب کی کمان سنبھالی اور عورتوں، بوڑھوں، معذوروں اور بقیہ لوگوں کو لے کر اپنے اندازے سے اس طرف بڑھے جہاں رات میں سب کو ٹھہرانے کا ان کا ارادہ تھا۔یہ رات یا اس رات کا کچھ حصہ مزدلفہ کے علاقے میں کھلے آسمان کے نیچے گزارنا ضروری ہے اور یہیں مغرب کی نماز عشا کے ساتھ ملا کر پڑھی جاتی ہے۔

مزدلفہ میں نہ خیمے ہیں نہ ہی پینے کے پانی اور بیت الخلا وغیرہ کا وافر انتظام۔ٹور والوں نے اپنے تجربے کی بنا پر چلنے سے قبل سب کو ناشتے کا ایک ایک پیکٹ پکڑا دیا تھا۔زیادہ تر لوگوں کے پاس وہ ویسے ہی رکھا تھا۔ یہاں آ کر اس کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔دور دراز تک کوئی دکان بھی نہیں جہاں سے آپ کچھ خرید کر کھا سکیں۔ یہ ناشتہ کھا کر آرام سے سونا تو ممکن نہیں تھا لیکن شب بیداری کے لیے اتنا کافی تھا۔ پھر اس میں ایک جوس کا پیکٹ اور ایک پانی کی چھوٹی بوتل بھی تھی۔ یہ بوتل اتنے کام کی تھی کہ خالی ہو جانے کے بعد بھی بہتوں نے پھینکی نہیں، جہاں پانی دستیاب ہوا وہاں سے اس کو پھر بھر لیا، پینے کے لیے بھی اور استنجے کے لیے بھی۔

آس پاس کی پہاڑیوں اور غیر مسطح زمین پر بھی تھوڑی سی جگہ دیکھ کر لوگوں نے اپنی اپنی دری، فولڈنگ چٹائی، چادر، مصلے، وغیرہ بچھا لیے تھے۔تقریباً تیس لوگوں کا ہمارا قافلہ عتیق صاحب کی سربراہی میں اس طرف بڑھ رہا تھا جہاں وہ رات میں ٹھہرنا چاہتے تھے اور جہاں سے ان کے اندازے کے مطابق صبح اپنے خیمے میں پہنچنا آسان ہوتا۔ دشواری یہ تھی کہ ضعیفوں اور عورتوں کی تعداد اچھی خاصی تھی اور ساتھ میں وہیل چیئر پر بھی لوگ تھے۔ پھر کہیں کہیں سڑک چھوڑ کر اوبڑ کھابڑ جگہ پر بھی چلنا پڑتا تھا۔

سڑک پر چلنا بھی کون سا آسان تھا۔لاکھوں لاکھ انسان اور ہزاروں ہزار گاڑیاں۔ پھر راستے کا کوئی اندازہ نہیں۔ سارے لوگ احرام میں۔ بھیڑ میں یہ خیال رکھنا بھی مشکل کہ ہمارے ساتھی دائیں مڑے یا بائیں۔لوگ چھوٹنے لگے،قافلہ بکھرنے لگا،تعداد گھٹنے لگی۔ مفتی صاحب اسی گروپ میں تھے انہوں نے کہا کہ سب کا ایک ساتھ ایک ہی جگہ پہنچنا تو مشکل ہے اور مقصد مزدلفہ میں شب بسری ہے تو ہم کیوں نہ اپنے خیمے میں چلیں وہ بھی تو مزدلفہ ہی ہے۔ چار پانچ لوگ تیار ہو گئے۔ کچھ اس لیے تیار نہیں ہوئے کہ وہ جس جگہ کو منیٰ سمجھ کر رہے ہے اسے مزدلفہ کیسے

مانیں۔ میں مفتی صاحب سے متفق تھا۔ ہم مزدلفہ کے ایک سرے پر تھے یہاں سے ہمیں اس سرے پر پہنچنا تھا جہاں سے مزدلفہ ختم ہوتا ہے اور منیٰ شروع ہوتا ہے۔ ہم سڑکوں اور فلائی اوور کی راہ پکڑ کر چلے۔

مفتی صاحب کا یہ چھناج تھا اور انہیں علاقے کا اندازہ بھی تھا لیکن ہر سال نئی سڑکیں اور کوبریاں بنتی رہتی ہیں اور ذہن میں بیٹھے ہوئے نقشے کو بگاڑتی رہتی ہیں چنانچہ ہم بھی بھٹکے۔ کئی جگہ سپاہیوں سے پوچھا۔ کچھ کو تو پتہ ہی نہیں تھا، کچھ نے بھٹکایا بھی۔ دراصل اتنی بڑی تعداد میں مقامی عملہ دستیاب نہیں ہوتا اس لیے وقتی طور پر دوسرے علاقوں سے لوگ بلا لیے جاتے ہیں جن کو علاقے کا صحیح صحیح اندازہ نہیں ہوتا۔ ہم اپنے اندازے اور بتانے والوں کی ہدایات کو ملا جلا کر آگے بڑھتے رہے۔ دن میں جانے پہچانے راستے بھی رات کی پیلی روشنی میں اجنبی لگ رہے تھے۔ بہرحال کسی طرح ہم سڑک نمبر 530 تک پہنچ گئے۔ پھر کیا تھا، پونے ایک بجے رات میں ہم خیمے میں تھے۔ جلدی جلدی وضو کر کے مغرب اور عشا پڑھی گئی۔ پھر جس کو جو پڑھنا تھا پڑھتا رہا، یا دعائیں مانگتا رہا۔

نفسی نفسی

صبح سات بجے سے لوگوں کا خیمے میں آنا شروع ہوا۔ اور اس کے ساتھ شروع ہوا کہانیوں کا دور۔ جتنے آدمی اس سے کئی گنا زیادہ کہانیاں۔ موٹے طور پر یہ سمجھ میں آیا کہ بمشکل دس بارہ لوگ وہاں تک پہنچ سکے جہاں پہنچنے کا ارادہ تھا۔ بقیہ راستے میں بچھڑتے چلے گئے۔ کون کدھر گیا کوئی نہیں بتا سکتا۔

آج دس ذی الحجہ تھی۔ دنیا بھر کے لیے بقرعید کا دن اور ہمارے لیے بڑے شیطان یعنی جمرۃ الکبریٰ کو کنکری مارنے کا دن۔ میں سویرے ہی جمرات کی طرف نکل گیا، آٹھ ساڑھے آٹھ بجے تک لوٹ بھی آیا۔ ابھی تک دس آدمی بھی نہیں لوٹے تھے۔ معلوم ہوا کہ بڑی بس راستے میں خراب ہوگئی تھی۔ اس پر سوار لوگوں کو بھی کئی کلومیٹر پیدل چلنے کے بعد ٹھہرنے کی ایک معقول جگہ ملی۔ اس قافلے کے بھی لوگ بکھر چکے ہیں۔ بچے کھچے لوگوں کو سمیٹ کر نفیس صاحب آرہے ہیں۔ اب صرف ایک کام تھا ـــــ جو آئے اس کا استقبال کرنا، اس کی دکھ بھری داستان سننا اور یہ حساب لگانا کہ کتنے آچکے، کتنے باقی ہیں۔ ظہر کے وقت تک آدھے سے زیادہ لوگ آچکے تھے لیکن یہ سلسلہ شام بلکہ رات تک چلتا رہا۔ دو تین لوگ تو دوسرے دن آئے اور ایک شخص دو دن بعد۔

گھنٹوں لوگوں کی گمشدگی کی وجوہات پر تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ کئی باتیں متفقہ طور پر ابھر کر سامنے آئیں۔ پہلی چیز تھی عمر۔ ہمارے یہاں رٹائر ہونے کے بعد یا قویٰ کے تھک جانے کے بعد ہی حج کا خیال آتا ہے، یعنی اسوقت جب گناہ کرنے کی نہ ضرورت ہو نہ صلاحیت، تاکہ حج سے لوٹنے پر انسان گناہوں سے محفوظ رہے۔

دوسری طرف دوسرے ملکوں سے آنے والے حجاج کی اوسط عمر ہم سے آدھی ہے۔ جوان اور پھرتیلے لوگ آسانی سے ناموافق حالات کا سامنا کرتے ہیں۔ ہمارے گروپ میں جن کے ساتھ عورتیں تھیں وہ حد سے زیادہ پریشان تھے۔ ہمارے معاشرے کی گھریلو عورتیں عموماً ایک وزنی سامان کی مانند ہوتی ہیں۔ لوگ اپنے ٹرنک اور بیگ کی طرح ہی ان کو گن کر اطمینان کرتے ہیں کہ سب صحیح سلامت ہے۔ سواری پر بھی اسی طرح چڑھاتے اتارتے ہیں اور ساتھ بھی لے کر چلتے ہیں تو ٹرالی بیگ کی طرح ـــــ پیچھے پیچھے گھسٹتی ہوئی۔

حج میں عورتوں کو یہ چھوٹ نہیں ہے کہ ان کی طرف سے طواف کوئی اور کر دے، یا پیسے دے کر کسی سے سعی کرا لیں، یا شیطان کو کنکر مارنے کا کام شوہر یا بیٹے یا بھائی کے ذمے دے دیا جائے۔ یہ سارے کام خود کرنے ہیں۔ اسی سے سمجھ میں آجانا چاہیے کہ اسلام ایک مسلمان عورت کو کیسا دیکھنا چاہتا ہے یعنی وہ لاکھوں کی بھیڑ میں بغیر کسی سہارے کے، بغیر کسی سے ٹکرائے اور بغیر بچھڑے طواف اور سعی کر سکتی ہو۔ ہزاروں کے مجمع میں شیطان کو پتھر مار سکتی ہو۔ آٹھ دس کلو میٹر آرام سے چل سکتی ہو اور راستہ بھول جانے پر بغیر کسی گھبراہٹ کے اپنی منزل تلاش کر سکتی ہو یا پوچھ سکتی ہو۔

حج میں مردوں کے سر کھلے رہتے ہیں عورتیں سر ڈھکتی ہیں لیکن چہرہ ڈھکنے کا حکم نہیں ہے۔ جاپان، کوریا، تھائی لینڈ، انڈونیشیا، ترکی ہر جگہ کی عورتیں جس اطمینان اور خندہ پیشانی سے یہ تمام ارکان کرتی دکھائی دیتی ہیں اسے دیکھ کر برِ صغیر کے مرد جھینپ جاتے ہیں۔ یہ ہلکی پھلکی میانہ قد عورتیں ـــــ جنہیں روزانہ بسوں اور لوکل ٹرینوں پر چڑھنے کی عادت ہے جو بھری پری سڑک کے ٹریفک میں راستہ بنانے کی عادی ہیں، جو اجنبی مردوں کے ساتھ کھڑے ہو کر سفر کرنے کے سلیقے سے واقف ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جن میں غضب کی خود اعتمادی ہے ـــــ

حج کا فریضہ ادا کرتے ہوئے اپنے ساتھ آئے مرد کو تعاون دیتی ہیں اس کے لیے بوجھ نہیں بنتیں۔ میں نے اپنے گروپ میں زیادہ تر عورتوں کو یہی دیکھا کہ وہ خود بھی پریشان ہیں اور ان کے ساتھ آئے ان کے محرم بھی۔

حج میں چہرہ کھلا رکھنے کے اللہ کے حکم کے باوجود عورتوں نے ایک نیا طریقہ نکالا ہے۔ سر پر اسپورٹس والی کیپ پہنتی ہیں اور اس کے باہر نکلے ہوئے چھجے کے سہارے ایک جالی دار کپڑا لٹکاتی ہیں جو انکے مطابق چہرے کو نہیں چھوتا اور پردے کی شرط بھی پوری کرتا ہے اس لیے اس سے احرام کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ اپنے مفتی صاحب نمازوں کے بعد بار بار میگا فون سے بولتے رہ گئے کہ ـــــ

''بھائی، پیشانی بھی چہرے میں داخل ہے۔ اس کو ڈھکنا بھی چہرے کو ڈھکنے کے برابر ہے۔ ایسا کرنے سے احرام کی شرط پوری نہیں ہوتی اور احرام ہی نہیں رہا تو حج کا کیا خاک ہوگا ؟''

لیکن:

کون سنتا ہے فغانِ درویش

گم ہونے والوں میں عورتوں کے علاوہ زیادہ تر وہی لوگ تھے جو اپنے خیموں میں محدود رہتے تھے۔ جنہوں نے اپنے آس پاس کی نشانیوں کو نہیں پہچانا۔ اپنے خیمے کی سڑک اور معلم کا نمبر یاد نہیں رکھا۔ حتٰی کہ جو چھپے ہوئے کارڈ خیمہ نمبر وغیرہ کی تفصیل کے ساتھ ملے تھے ان کو بھی ساتھ نہیں رکھا اپنے بیگ میں بند کر کے چھوڑ گئے۔ اس تیس چالیس لاکھ کے مجمع میں جو کئی کلو میٹر میں بکھرا ہوا ہے، جس میں سیکڑوں زبانوں کے بولنے والے آپ کے چاروں طرف ہیں، ہر طرف ایک جیسے خیمے اور ایک جیسے بازار ہیں، کسی کا دو دن تک بھٹکتے رہنا مشکل نہیں۔

حجاج کی ٹریننگ کے دوران بھی یہ تفصیلات نظرانداز کردی جاتی ہیں۔عربی کی گنتی نہ جاننے کی وجہ سے سڑک کا نمبر بتا کر بھی پوچھ نہیں سکتے۔سیکڑوں میں ایک عربی ہوتا ہے جو انگریزی یا اردو جانتا سمجھتا ہے۔جگہ جگہ نقشے لگے ہوئے ہیں جن میں نشاندہی ہوتی ہے کہ آپ اس وقت کہاں کھڑے ہیں لیکن نقشے کو سمجھنے کی توفیق بھی سب کو حاصل نہیں ۔ پھر سڑک کے کنارے نصب یہ بڑے بڑے نقشے بھی عربی میں ہیں۔سب سے بڑھ کر یہ کہ قیامتِ صغریٰ کا سماں ہے،حشر کے میدان جیسا ماحول ہے، نفسی نفسی کا عالم ہے، کسی کو کسی کی فکر نہیں، کوئی کسی کا ہاتھ پکڑ کر سہارا دینے والا نہیں۔کوئی چاہے کہ کسی خیمے میں بیٹھ کر دس منٹ ستا لے تو وہاں کوئی پاؤں بھی نہیں رکھنے دیتا۔اپنا بطاقہ،کارڈ، پٹا یا کنگن چھوڑ کر باہر نکل گئے ہیں تو اپنے ہی خیمے کے دروازے کا گارڈ آپ کو نہ گھسنے دے۔

دراصل یہ پانچ دن بے خبری کے نہیں انتہائی مستعدی اور یکسوئی کے ہیں۔اگر ایک ایک بات پر توجہ نہیں ہے، لا پروائی اور غفلت طاری ہے تو نہ قاعدے سے منیٰ میں وقوف ہوگا نہ عرفات میں، نہ مزدلفہ میں قیام ہوگا نہ وہاں سے کنکر چن کر لاسکیں گے۔ میں نے دو طرح کے لوگ دیکھے۔ کچھ تو عزیزیہ کی پہاڑیوں سے تین چار دن پہلے ہی پتھروں کے ٹکڑے توڑ توڑ کر پوٹلی بنا رہے ہیں۔اور کچھ وہیں جمرۃ کے آس پاس گرے کنکر اٹھا کر مارتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔جبکہ انہیں مزدلفہ سے کنکریاں چننے کے لیے رات بھر کا موقع ملا اور یہی کرنا مسنون ہے۔

آٹھ دس گھنٹہ بھٹک کر لوٹنے والے ایسے بھی تھے جو سمت کا اندازہ نہ ہونے سے مزدلفہ سے لوٹتے ہوئے خیمے کی طرف آنے کی جگہ جمرات کی طرف بڑھ گئے۔ایک جگہ پہنچ کر پیدل ٹریفک بھی ون وے کر دیا جاتا ہے۔اب واپس لوٹنا چاہتے ہیں تو وہاں کھڑے سپاہی جمرات کی طرف گھما دیتے ہیں۔اسی میں بھلائی بھی ہے کیونکہ سامنے سے آرہے انسانوں کے ریلے کے

خلاف جانے میں ہلاکت کا خوف ہے اس کا ایک فائدہ تو ہوا کہ قیام مزدلفہ کے بعد کا ضروری رکن رمی جمار ،یعنی شیطان کو کنکر مارنا،ادا ہو گیا لیکن وہ کئی بار اسی لائن میں موڑ دیے گئے اس لیے کہ وہ بار بار گھبراہٹ میں اسی راستے کی طرف گھومتے رہے اور بار بار شیطان کے سامنے سے گزرنے کے لیے بھیجے جاتے رہے۔

دس ذی الحجہ کو کنکر مارنے کا اولیٰ وقت صبح صادق سے غروبِ آفتاب تک ہے لیکن پوری رات کنکر مارے جاسکتے ہیں۔ اگر اس پوری مدت میں نہیں مار سکے تو دم واجب ہوگا۔ نفیس صاحب نے جب دو دن قبل یہ مسئلہ پہلی بار سب کو بتایا اور کہا کہ ایسی حالت میں دم دینا ہوگا، تو کئی چہروں پر دم دینے کی اصطلاح نے الجھن پیدا کر دی۔ میں آہستہ سے دم دینے کی وضاحت کرنے کو کہا تو انہوں نے فوراً بتایا— ''ایک قربانی واجب ہو جائے گی۔'' تب جا کر سب کو اطمینان ہوا۔ کیونکہ ہماری بول چال میں دم لینے اور دم دینے کے ذکر سے بہت خطرناک صورتحال کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

یہ دَم بھی عجب چیز ہے۔ عربی میں خون کو کہتے ہیں اور اس سے اصطلاحاً ایک قربانی مراد ہوتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ احرام کی حالت میں اگر آپ نے ایک مچھر یا مکھی بھی مار دی تو جرمانے میں ایک جانور ذبح کرنا پڑے گا۔ گذشتہ چار پانچ دنوں میں کہیں مچھر دکھائی نہیں دیے تھے لیکن منٰی کے خیمے میں اکا دکا مچھر گھومتے دکھائی دیئے۔ گویا حاجیوں کا امتحان لینے نکلے ہوں — 'مجھے مارو اور دم دو۔' اس پر یہ تبصرہ بھی آیا کہ یہ احرام پوشوں کا MosquitoTest ہے۔ اور مکھیاں جو بار بار آ کر پیشانی پر بیٹھ جاتی ہیں یہ FlyTest ہے۔ پتہ نہیں عورتیں حج پر آنے سے قبل سر کے جوؤں سے چھٹکارا پا لیتی ہیں یا نہیں۔ کیونکہ ایک جوں کی شہادت سے حج خطرے میں پڑ جائے گا کیونکہ اگر دم واجب ہو گیا اور دیا نہیں تو حج گیا۔

میں صبح جمرۃ کی طرف اکیلا نکل گیا تھا۔ سمت وغیرہ کا اندازہ ایک دن قبل ہی گھوم پھر کر کر چکا تھا اس لیے دشواری نہیں ہوئی۔ جمرۃ کی طرف جاتے ہوئے آس پاس پھیلا بازار بھی میری توجہ کا مرکز بنا رہا۔ یہ فٹ پاتھ پر پھیلا ہوا بازار بلاشبہ ایک انٹرنیشنل مارکٹ ہے جس میں چین سب پر حاوی ہے۔ طرح طرح کے سامان سڑکوں کے کنارے، پلوں کے نیچے، پارکوں میں، غرض جہاں بھی دو چار فٹ جگہ مل گئی وہیں بکتے دکھائی دیں گے۔

یہ دکانیں نوے فیصد عورتیں چلاتی ہیں، اور ان میں بھی اکثریت نائجیریا، تنزانیہ اور یوگانڈا وغیرہ کی سیاہ فام عورتوں کی ہے۔ کھانے پینے کی چیزوں کی بات کریں تو چائے اور کافی کی بکثرت دکانیں دکھائی دیں۔ لپٹن یلو لیبل کے ٹی بیگ اور نسکیفے کی کافی سب سے عام برانڈ ہیں۔ دو ریال فی کپ کی قیمت پر بکنے والی یہ چائے کافی ہمارے لیے بھلے ہی مہنگی رہی ہو لیکن اس کے خریدار کم نہیں تھے۔ ہم میں سے بھی کچھ نے شوقیہ طور پر یا عادتاً ان سے استفادہ کیا لیکن اپنی پسند کی چائے ہمیں اپنے خیمے میں دستیاب تھی اس لیے اس طرف زیادہ توجہ نہیں جاتی تھی۔ بلکہ اپنے چائے کے کنٹینر کی نگرانی کرنی پڑتی تھی ورنہ آس پاس کے خیموں سے کوئی گلاس یا تھرمس لیے آتا اور چائے بھر کر بقول نفیس صاحب اَلا تُور ہو جاتا۔

کھانے کی چیزوں میں برگر، بریڈ آملیٹ، چکن فرائی، بریانی، کلیجی، ابلے انڈے، پھل سب کچھ دستیاب تھا۔ ان کے خریدار بھی آس پاس ہی پھیلے تھے۔ دراصل جتنے لوگ خیموں میں تھے ان سے کچھ ہی کم خیموں سے باہر رہے ہوں گے۔ یہ وہ مقامی حاجی ہیں جن کا کہیں اندراج نہیں۔ انہوں نے خالی جگہوں پر دریاں اور پلاسٹک کی چٹائیاں بچھالی تھیں یا فولڈنگ تنبو کھڑے کر لیے تھے۔ یہ سب بھی آس پاس ہی بک رہے ہیں لے کر آنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اسے یہیں پڑا ہوا چھوڑ کر لوٹ گئے۔ انہیں ثواب لے کر جانے میں زیادہ دلچسپی تھی۔

اس طرح آنے والوں میں بہت سے لوگ بال بچوں سمیت آئے تھے۔ یہاں سب کی دلچسپی اور ضرورت کا سامان دستیاب تھا۔ چوڑیاں، کڑے، کان میں ڈالنے والے ٹاپس اور رنگ۔ زنانہ لباس، بچوں کے لباس، شرٹ، جینز، عبا، ٹوپیاں، کپڑوں کے پیس، چپل، چھتریاں، رومال، سگریٹ، عطر، تسبیح، طغرے اور بھی پتہ نہیں کیا کیا۔ لیکن ہر جگہ ہر سامان نہیں ملتا۔ جس علاقے میں جس ملک والوں کے خیمے ہیں وہاں ان کے ذوق کی چیزیں اور دوسرے علاقے میں دوسری چیزوں کی دکانیں۔ سب سے رنگ برنگا نظارہ اس علاقے میں دیکھنے کو ملتا ہے جدھر افریقی ممالک کے خیمے ہیں۔ شوخ رنگ کے زنانہ مردانہ کپڑے، چھینٹ والے پرنٹ، طرح طرح کی ٹوپیاں، کھانے پینے کی عجیب وغریب چیزیں۔ یہاں بھیک مانگنے والوں میں بھی اکثریت انہی لوگوں کی ہے ہر تھوڑی دور پر ایک کنارے کوئی سیاہ فام عورت ایک دو بچوں کو لیے بیٹھی مل جاتی ہے۔ ان کی شکلیں اتنی ملتی جلتی ہیں کہ کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ ایک ہی عورت تھوڑی دیر دکان پر بیٹھتی ہے اور تھوڑی دیر 'یا حاجی فی سبیل اللہ' کا نعرہ لگاتی ہے۔ کیا پتہ جو لگتا ہے وہی صحیح ہو، لیکن کون سا کام فل ٹائم ہے اور کون سا پارٹ ٹائم؟ اس لیے کہ آمدنی تو 'فی سبیل اللہ' ہی میں زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

شیطانی حرکت

مغربی ممالک کو جو خیمے الاٹ کیے گئے ہیں ان میں اور ہمارے خیموں میں ظاہری طور پر کوئی فرق نہیں محسوس ہوتا لیکن ان کے پاس سے گذرتے ہوئے یہ احساس ہو جاتا ہے کہ اندر کا ماحول ہمارے خیموں سے قطعی مختلف ہے۔ یہ زیادہ صاف ستھرے، پرسکون اور کشادہ ہیں۔ ان کا محل وقوع بھی ایسا ہے کہ بسیں ان کو بہت پاس سے مل جاتی ہیں۔ شیطان بھی یہاں نسبتاً بہت کم دور ہے۔ کنکر مارنے جاتے ہوئے بھی ذہن اس ترجیحی سلوک میں الجھا رہا۔

جمراۃ کی طرف جیسے جیسے آگے بڑھتے گئے ویسے ویسے لوگوں کے ساتھ آنے اور کارواں بنتے جانے کا احساس ہوتا رہا۔ پھر یہ کارواں سیل رواں میں تبدیل ہو گیا اور اپنا وجود اس میں ایک قطرے کی مانند محسوس ہونے لگا۔ لبیک کی انفرادی و اجتماعی صدائیں ماحول کو جوش اور جذبے سے بھر رہی تھیں۔ اور مجمع ایک سرشاری کے عالم میں رواں دواں تھا۔

پرانی تصویروں میں جمرۃ الصغریٰ، جمرۃ الوسطیٰ اور جمرۃ الکبریٰ تینوں ایک ستون کی علامت سے پہچانے جاتے تھے۔ پھر جیسے حج کے لیے آنے والوں کی تعداد بڑھی ان ستونوں کی لمبائی چوڑائی بھی بتدریج بڑھتی گئی اور آگے چل کر دیوار کی شکل اختیار کر گئی۔ آج چار منزلہ عمارت جتنی اونچی یہ تین دیواریں کھڑی ہیں جن کے آس پاس 12 عدد اسکیلیٹر لگے ہیں۔ یہ مختلف راستوں سے آنے والوں کو پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی منزل پر پہنچاتے ہیں۔ ہر منزل پر آپ آسانی سے کنکر مار سکتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ بغیر اسکیلیٹر کا استعمال کیے نیچے گراؤنڈ فلور سے ہی کنکر مارتے ہوئے گذرتے ہیں۔

کنکر مارنے کو یہاں آنے والوں کے اس تا حد نگاہ تک پھیلے چار پانچ کلو میٹر لمبے متحرک مجمع کو کنٹرول کرنا برسوں کے تجربے اور مہارت کے ساتھ ساتھ غضب کی قوت فیصلہ سے ہی ممکن ہے۔ پلک جھپکتے ہی یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ کدھر بھیڑ کا دباؤ زیادہ ہے کس طرف کے دروازے کو خالی کرنا ہے، بھیڑ کو کیسے دو طرف بانٹنا ہے۔ کب لوگوں کو اسکیلیٹر کی طرف جانے دینا ہے اور کب ادھر جانے والوں کو روک دینا ہے۔ یہ کام وہاں کھڑے عملے کا نہیں بلکہ کسی کنٹرول روم سے ہی ممکن ہے جہاں یقیناً شارٹ سرکٹ کے اسکرین لگے ہوں گے۔ ایسے کیمرے تو کئی جگہ مجھے دکھائی دیے۔ اس کام میں یقینی طور پر ہیلی کاپٹر کی مدد بھی لی جاتی ہے کیونکہ ایک نہ ایک ہیلی کاپٹر دن رات منیٰ مزدلفہ اور عرفات کے اوپر فضا میں چکراتا رہتا ہے۔ میں نے جمرۃ کے پاس بیک وقت تین ہیلی کاپٹر اڑتے دیکھے ہیں۔ یہ بڑی آسانی سے کنٹرول روم کو اس بھیڑ کی جانکاری دے سکتے ہیں جو اگلے آدھے پون گھنٹے میں وہاں پہنچنے والی ہوتی ہے اور اسی کے حساب سے وہ پیشگی تیاری کر سکتے ہیں۔

جمرۃ کے تقریباً دو کلو میٹر پہلے سے ہی لگتا ہے کہ گویا پہنچ چکے ہیں۔ سامنے ہونے کے باوجود چکر دار راستے کی وجہ سے دوری بڑھ جاتی ہے اور بھیڑ کی وجہ سے رفتار نہیں ہوتی۔ خیموں کا سلسلہ ختم ہوتے ہی ہمیں ایک سرنگ سے گذرنا پڑا۔ یہ تقریباً ایک کلو میٹر لمبی سرنگ ہے جس میں بڑے بڑے ایگزاسٹ فین لگے ہوئے ہیں۔ ان کی وجہ سے سرنگ کے دہانے سے تازہ ہوا تیزی سے اندر آتی رہتی ہے اور گھٹن کا قطعی احساس نہیں ہوتا بلکہ یہ راستے کھلے ہوئے راستے سے زیادہ سکون بخش ہوتے ہیں کیوں کہ اتنی دیر تک انسان دھوپ اور دھول سے محفوظ رہتا ہے۔ ویسے مجھے لسکر صاحب نے ناک اور منھ پر باندھنے والی ایک پٹی عنایت کی تھی یہ بہت کام آئی۔ ایسی پٹی آپریشن تھیٹر میں استعمال ہوتی ہے اور نہ صرف دھول بلکہ انفکشن سے بھی بچاتی ہے۔

سرنگ میں چلتے ہوئے میں نے کافی اونچائی پر ہوائی جہاز کے پنکھے کی طرح زوردار آواز کرتے ایگزاسٹ فین کو غور سے دیکھا تو اس کی جالی سے پانی کی بوتلیں اور مشروبات کے کین چپکے ہوئے نظر آئے۔ تھوڑی حیرت ہوئی کہ یہ وہاں کیسے پہنچے۔ پھر خود ہی سمجھ میں آ گیا کہ اگر کوئی آدمی دوری تک بھی اسے اچھال دے تو وہ بقیہ کام اس کا کھنچاؤ کر لے گا۔ ہاتھ میں پانی کی بوتل تھی ہی بے ساختہ خواہش ہوئی کہ اسے اوپر اچھال کر دیکھوں کیا ہوتا ہے۔ ہاتھ کو حرکت دے بھی چکا تھا کہ اچانک ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ اس پنکھے کے سامنے کی جالی ایک جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی اگر بوتل اس سے اندر داخل ہو گئی ہوتی تو شاید پنکھے کو کوئی نقصان ہو جاتا۔ سوچا جس کو کنکر مارنے جا رہا ہوں وہ یہاں بھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آ رہا ہے۔ میں نے فوراً وہ بوتل راستے کے کنارے ڈال دی حالانکہ اس میں پانی ابھی بچا ہوا تھا، اور پانی کی ضرورت یہاں کسی بھی چیز سے زیادہ ہوتی ہے۔

لوٹتے وقت اسی کے متوازی دوسری سرنگ میں داخل ہوا۔ آتے ہوئے غور کیا تو دیکھا ان پنکھوں کی زبردست طاقت کے آگے صرف خالی نہیں بلکہ پانی سے بھری بوتلیں بھی چپک جانے کو مجبور ہیں۔ لیکن سرنگ سے باہر نکلتے وقت جو نظارہ دکھائی دیا اس نے بدن میں سہرن پیدا کر دی۔ پنکھے کے اوپر کی جالی سے صرف بوتل اور ڈبے ہی نہیں کئی کبوتروں کے بے جان جسم بھی چپکے ہوئے تھے۔ کبوتروں کا بسیرا اسی سرنگ میں ہے اور وہ یقیناً اپنی فطری صلاحیت کی بنا پر ان پنکھوں کی کشش کے دائرے سے بچ کر آنے جانے کے عادی ہوں گے۔ اس وقت بھی کچھ کبوتر انہی پنکھوں کے اوپر بیٹھے تھے۔ دل نے گواہی دی کہ ضرور کسی کی پھینکی ہوئی بوتل سے بچنے کی کوشش میں بھڑکے ہوئے کبوتر پنکھے کی زد میں آ گئے ہوں گے اور یہ معصوم کبوتر کسی حاجی کی ہی شرارت کا شکار ہوئے ہوں گے۔

میں نے پیدل لمبا چکر کاٹنے پر اسکیلیٹر کو ہی ترجیح دی تھی اور لوگوں کے اس دھارے میں شامل ہو گیا جو اسکیلیٹر کے ٹاور نمبر 4 کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہاں دو خودکار سیڑھیاں تھیں جو تیسری منزل تک پہنچاتی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ یہاں تعینات عملہ آنے والوں کو دونوں طرف بانٹ کر بھیجتا تھا تاکہ دونوں سیڑھیوں کا برابر استعمال ہو سکے اور یہاں بھیڑ جمع نہ ہو۔ دوسری سیڑھیوں سے بھی لوگ تیسری منزل پر آ رہے تھے۔ اس کے باوجود یہاں کوئی خاص بھیڑ نہیں تھی۔ میں نے بڑے اطمینان سے ایک ایک کر کے کنکر مارا۔ اچانک یاد آیا کہ منہ پر تو دھول سے بچنے والی پٹی بندھی ہے۔ میں نے جلدی سے اسے ہٹا لیا تاکہ مارنے والے کا چہرہ دکھائی دے اور سندر رہے۔

وھائٹ منی ــ بلیک منی

دس ذی الحجہ کی رمی کے بعد ہر حاجی کو صرف ایک کام باقی رہتا ہے، یعنی قربانی۔ اس کے بعد حلق کرا کے احرام کھول دینا ہے۔ یہاں عالم یہ تھا کہ ظہر کے بعد تک کم از کم دس لوگ لوٹ نہیں پائے تھے۔ نفیس صاحب کو گذشتہ تجربات سے اس بات کا اندیشہ تھا۔ اسی لیے انہوں نے مدرسے میں قربانی کا وقت شام کے بعد رکھوایا تھا تا کہ مغرب سے قبل سب کا جمرۃ الکبریٰ پر کنکر مارنے کا رکن پورا ہو جائے۔ اسی وجہ سے صبح نو بجے تک کنکر مار کر فارغ ہو جانے کے بعد بھی میں احرام میں ہی رہا۔

دو بجے کے آس پاس جتنے لوگ آ چکے تھے ان کو جمع کیا گیا۔ وہ گروپ بنا کر بینر اور جھنڈے کے ساتھ شیطان کو کنکر مارنے روانہ ہوئے۔ یہ بالکل سیدھا راستہ ہے۔ سب کو ایک ہی طرف جانا ہے، پھر کنکر مار کر پوری بھیڑ ایک ہی طرف واپس لوٹتی ہے۔ دوسری سڑکوں سے آنے والے بھی اسی طرح اپنے خیموں کی طرف واپس لوٹتے ہیں اس کے باوجود یہ چالیس پینتالیس لوگ نہ ایک ساتھ جا پائے نہ ایک ساتھ لوٹ پائے، بلکہ کچھ لوگ جو کل گم ہو چکے تھے وہ دوبارہ گم ہوئے۔ آس پاس کے خیموں سے بھی ایسی ہی اطلاعات مل رہی تھیں۔

موٹے طور پر بیس سے پچیس فیصد لوگ راستہ بھولتے اور بھٹکتے رہے۔ دو گھنٹے سے دو دن تک۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس پر سعودی حکومت، مختلف ممالک کی مرکزی و صوبائی حج کمیٹیاں اور ٹور آپریٹرس سب کو توجہ دینی چاہیے کیونکہ حاجیوں کی تعداد ہر سال بڑھ رہی ہے۔ ابھی باضابطہ اور بے ضابطہ حج کرنے والوں کی کل تعداد 60 لاکھ تک پہنچ جاتی ہے جو عنقریب ایک کروڑ تک پہنچے گی۔ ایسے میں گم شدگی کی وارداتیں اور بھی بڑھیں گی۔

خیموں میں سناٹا سا پھیلا تھا۔ زیادہ تر لوگ یا تو پتھر مارنے گئے تھے یا گم تھے۔ ایسے میں خیمے میں موجود لوگ زیادہ تر بات چیت میں ہی مصروف تھے۔ بات سے بات نکلتی گئی اور کئی اندر کی باتیں سامنے آئیں۔ معلوم ہوا کہ خیموں کی جگہ کو حکومت ہر سال نیلام کرتی ہے۔ جتنی نزدیک کی جگہ اتنی زیادہ اس کی بولی۔ دور کی جگہیں سستے میں چھوٹ جاتی ہیں۔ اس نیلامی میں معلم ہی شریک ہوتے ہیں اور بولی لگا کر اور خیمے حاصل کرتے ہیں۔ جس نے زیادہ پیسے ادا کر کے جگہ لی ہو وہ حج کمیٹی یا ٹور اینڈ ٹریولس والوں سے زیادہ پیسوں کی مانگ کرتے ہیں۔

ہر حاجی کے کھاتے سے معلم کو ایک ہزار انتیس (1029) ریال ملتے ہیں۔ یہ تو وھائٹ منی ہے۔ اب شروع ہوتی ہے بلیک منی۔ ایک ہزار سے لے کر پانچ ہزار ریال فی حاجی وصول کر کے یہ معلم اسی اعتبار سے ان کو سہولتیں فراہم کرتے ہیں۔ ہماری سمجھ میں آ گیا کہ ہم دور کیوں رکھے گئے۔ منیٰ کے باہر کے خیمے ہمیں کیوں ملے، بسیں بہت اچھی کیوں نہیں ملیں۔ ضرور فی حاجی ہزار ریال سے زیادہ نہیں دیے گئے ہوں گے۔ ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اچھی جگہ اور اچھے انتظام کے لیے ساٹھ ستر ہزار روپے کا مزید خرچ برداشت کر سکتے ہیں اور یہاں ہم لوگ تو سستے پیکج کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اسی لیے ہمیں ٹور آپریٹر بھی نفیس صاحب جیسے ہی ملتے ہیں جو یہ سمجھاتے ہیں کہ ــــ

> ''میرے بھائی! حج مجاہدے کا نام ہے۔ اللہ کی راہ میں آپ جتنی مشقت کریں گے اتنا ہی اجر ملے گا۔ جتنا پیدل چلیں گے اتنی ہی نیکیاں قدم قدم پر ملیں گی۔ اس لیے میرے بھائی، آپ پریشانیوں سے نہ گھبرائیں بلکہ اس راہ میں جان و مال کے ساتھ تیار رہیں۔ کیونکہ حج مالی اور بدنی دونوں طرح کی عبادت ہے۔''

شاہی محل کی جھلک

صبح تک سب کی قربانی کی خبر مدرسہ صولتیہ سے آچکی تھی۔ سوچا اب حلق کرا کے احرام کھول لوں اور کرتے پاجامے میں آجاؤں۔ یہاں ذی الحجہ کی گیارہ تاریخ تھی اور ہندوستان میں آج ہی بقرعید ہے۔ سوچا یہاں کی بقرعید تو پسینے سے بھیگے احرام میں گذری، اپنے یہاں کی بقرعید کے دن نئے کپڑے نکالے جائیں۔

حلق کرانا تھا۔ جمراۃ سے باہر آتے ہی بیسیوں حلاقہ یعنی حجامت کی دکانیں ہیں۔ کل لوٹتے ہوئے ان کا حال اور چال دیکھتا آیا تھا۔ مقامی سے دس ریال اور بیرونی سے پندرہ ریال۔ ایک ڈیڑھ منٹ میں سٹاسٹ سر کے بالوں کا صفایا۔ کسی پر دوبارہ توجہ دینے کی فرصت نہیں۔ بات کسی اور سے ہو رہی ہے استرا کسی اور کے سر پر پھیرا جا رہا ہے۔ مشورہ ہوا کہ ہم عزیزیہ جائیں۔ وہیں کہیں حلق کرائیں۔ نہائیں، کپڑے بدلیں، عطر لگائیں اور بھاگ کر حرم شریف جائیں۔ طواف زیارت کریں، سعی کریں۔ پھر بھاگ کر جمراۃ آئیں اور مغرب کے وقت تک آج کی کنکریاں ماریں۔ بس آج کا کام بھی مکمل صرف آخری دن کی رمی باقی رہے گی۔

میرے ساتھ آٹھ لوگوں کی ٹیم بن گئی۔ انہیں بھروسا تھا کہ میں راستہ نہیں بھولوں گا اور عزیزیہ پہنچنے کا کوئی ذریعہ نکال لوں گا۔ میں سب کے ساتھ اس پل کی طرف بڑھا جہاں تک میں مغرب اور عشاء کے درمیان جا کر لوٹا تھا اور جہاں بہت سی ٹیکسیوں کو رکتے دیکھا تھا۔ آدھے راستے میں ہی ایک سامان ڈھونے والی گاڑی کھڑی تھی جسے پک اپ وین یا چھوٹا ٹرک کہہ سکتے

ہیں۔اس کے ڈرائیور اور اس کے پاس کھڑے شخص کی متلاشی نگاہیں ہم پر پڑ رہی تھیں۔

بات شروع ہوئی۔ پندرہ ریال فی کس، پھر دس ریال، پھر پانچ ریال فی کس پر بات طے ہوگئی۔ہم اس پر سوار ہوئے۔ نیچے پلاسٹک کی دری تھی۔اس پر عورتیں اور بوڑھے لوگ بیٹھے اور بقیہ کھڑے رہے۔آگے بڑھتے ہی ایک اور گروپ بارہ لوگوں کا دکھائی دیا۔اپنے ہی ساتھی تھے۔صابر بھائی بھی تھے۔گاڑی رکوا کر سب کو اسی پر لے لیا گیا۔صابر بھائی چلے تھے تو انہیں فکر تھی کہ کوئی سواری ملے گی یا نہیں۔اس اچانک ملی نعمت سے چہک اٹھے۔گاڑی کے بڑھتے ہی مٹھی باندھ کر چلائے۔۔۔ 'نعرۂ تکبیر، اللہ اکبر! نعرۂ رسالت، یارسول اللہ !!'

عزیزیہ میں اسی صالون میں داخل ہوا جہاں عمرے کے بعد بال مشین سے چھوٹے کرائے تھے۔اس بار اس نے استرا چلایا اور پندرہ ریال لیے۔ پہلے مشین سے کام ہوا تھا اب ہاتھ لگا۔ہاتھ کے کام کا دام زیادہ ہے۔ میں نے بھی سر جھکا دیا۔

نہادھو کر ہم تین لوگ ایک ساتھ حرم کی طرف بھاگے۔اس بار ایک منی بس ملی جس نے پانچ پانچ ریال لیے۔ایک جگہ جا کر ٹریفک والے نے آگے نہیں جانے دیا۔وہاں سے سرکاری بسیں حاجیوں کو حرم شریف تک لے جارہی تھیں۔ یہ مفت خدمت تھی لیکن آج اس میں بھی ڈرائیور اور کنڈکٹر مل کر پانچ ریال سے بیس ریال تک، جو بھی ہاتھ لگ جائے، وصول کر رہے تھے۔دیکھ کر طبیعت بھنا گئی۔

دوری صرف سوا کلومیٹر۔ایک سرنگ درمیان میں ہے اس کو پار کیا اور سامنے حرم شریف۔سیکڑوں لوگ جا ہی رہے تھے۔ہم تین بھی پیدل ہی نکل لیے۔ ہاں نقصان یہ ہوا کہ ظہر کی جماعت چھوٹ گئی۔ہم جب داخل ہورہے تھے تو اس دن وفات پانے والوں کے جنازے باہر آرہے تھے۔تبرکاً جنازے کو ہاتھ لگا کر چار قدم ان کے ساتھ چلے۔ان پر رشک آیا اور بے

ساختہ حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل صاحب یاد آئے جو یہیں دفن ہونے کی شدید آرزو لیے آئے اور بالآخر یہیں پیوندِ خاک ہوئے۔ ایسا جذبہ اور ایسا نصیب سب کو کہاں حاصل ہوتا ہے۔

ظہر سے فارغ ہو کر ہم نے طواف کیا اور سعی میں مصروف تھے کہ اسی دوران عصر کی اذان ہو گئی۔ عصر کی نماز کے بعد ہم نے بچی ہوئی سعی مکمل کی اور باہر بھاگے تا کہ کسی طرح مغرب تک جمراۃ پہنچ سکیں۔ کل تو رمی کا وقت صبح صادق سے ہی شروع ہو گیا تھا لیکن آج اور آئندہ کل کا وقت زوال کے بعد شروع ہوتا ہے۔ آج مغرب تک کنکر مار لینا مستحب ہے۔ یہاں عصر کا وقت گذر رہا تھا۔ صبح آٹھ بجے سے اب تک ایک ایک منٹ مصروف گذرا تھا۔ اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ کہیں کچھ کھا پی سکتے۔ طواف اور سعی کے بعد بھر پیٹ زمزم پیا تھا۔۔۔ بس!

ٹیکسی اور بس کے ملنے کی جگہ دریافت کر کے ادھر بھاگے۔ ٹیکسی یہاں سیارہ کہلاتی ہے۔ خلائی سیارہ تو دیکھنا بھی نصیب نہیں چلو زمینی سیارہ ہی سہی۔ طواف کرتے ہوئے چپل ایک جگہ رکھی تھی وہ طواف کے بعد نہیں ملی۔ نئی ہوائی چپل نے پیر کاٹ دیا تھا اسی لیے چمڑے کی چپل نکالنی پڑی تھی۔ اسے ایسی جگہ بڑے سلیقے سے رکھا تھا جہاں پہلے سے کئی چپلیں تہ کر کے رکھی تھیں۔ لگتا ہے یہ چپل رکھنے کی مناسب جگہ نہیں تھی اور شاید صفائی کرنے والوں نے اسے کہیں پھینک دیا۔ بہر حال غلطی اپنی تھی۔ مجبوراً مسجد سے ننگے پاؤں ہی باہر آنا پڑا۔

ہم تین ایک ساتھ تھے۔ جدھر سواری ملنے کا امکان تھا وہاں کا نظارہ دیکھ کر ہوش اڑ گئے۔ بلا مبالغہ بیس پچیس ہزار آدمی ہر بس، ٹرک، ٹیکسی، کار یا اس جیسی کسی چیز پر شہد کی مکھیوں کی طرح جھپٹ رہے تھے۔ ہم نے ادھر بڑھنا شروع کیا۔ جدھر سے یہ گاڑیاں بھری ہوئی آ رہی تھیں۔ لوگ کسی ٹرک جیسی چیز میں کھڑے ہوئے، بسوں کی چھت پر بیٹھے ہوئے یا کسی گاڑی کے پیچھے پیر ٹکنے بھر جگہ پر لٹکے ہوئے بھی چلے آ رہے تھے اور سب کی منزل ایک ہی تھی۔۔۔ جمراۃ۔

اسی بھیڑ بھاڑ میں چند موٹر سائیکل سوار بھی دکھائی دیے۔ پہلے تو لگا کہ رضا کار ہیں پھر جلد ہی یہ غلط فہمی دور ہو گئی۔ معلوم ہوا یہ بھی سو ریال فی کس کے طلبگار ہیں۔ایک پھیرے میں ایک ہی آدمی لے جاتے ہیں۔ان کو بھی زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑتا تھا۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی اس کام میں اونٹ کیوں نہیں استعمال میں لائے جاتے؟ اونٹ کی سواری کی سنت ہی ادا ہو جاتی۔

سیکڑوں گاڑیوں کو کھٹکھٹاتے اور جھانکتے ہوئے ہم دو کلو میٹر پیچھے چلے گئے۔تب جا کر ایک بس میں گھسنے کا موقع ملا۔ایک بنگلہ دیشی اس میں پیسے وصول رہا تھا۔تیس ریال سے شروع کر کے پچیس ریال میں معاملہ طے ہوا۔اس مول تول میں میرے علاوہ ایک اور شخص پیش پیش تھے معلوم ہوا پاکستانی ہیں، کرمنل کے وکیل ہیں اور میڈیا سے بھی جڑے ہیں۔ گفتگو کے دوران بس اپنا سفر طے کرتی ہوئی منیٰ کے دوسرے سرے پر پہنچی۔ وکیل صاحب نے ایک پہاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا — ''دیکھو وہ بادشاہ کا محل ہے۔ یہ سامنے دو گیٹ ہیں۔ایک سے صرف بادشاہ کی سواری گذرتی ہے، دوسرے سے بقیہ لوگ آتے جاتے ہیں۔'' لہجے میں چھپا طنز اور تأسف پوشیدہ نہ رہا۔

میں نے انہیں مخاطب کر لیا اور پوچھ بیٹھا— ''یہاں خاص خاص مقامات پر دعا کرتے ہوئے بادشاہت کے خاتمے اور عوامی حکومت کے قیام کی دعا کی آپ نے؟''

ایک لحظہ کو لڑکھڑائے پھر سنبھل کر بولے— ''نہیں۔لیکن کرنی چاہیے تھی۔''

میں نے کہا — ''ضرور کیجیے۔میں بھی کروں گا۔''

بس والوں نے جمراۃ تک چھوڑنے کی بات کی تھی لیکن تقریباً دو کلو میٹر دور چھوڑ دیا اور دکھا دیا کہ دیکھو سامنے ہے۔کوئی چارہ نہ تھا۔مغرب کا وقت قریب تھا ہم تینوں پیدل جتنی تیزی سے بڑھ سکتے تھے آگے بڑھے۔پل پر مغرب کی اذان ہو گئی۔ نیچے آتے آتے نماز ختم ہو گئی۔ہم

نے جمرات کے سامنے والی سڑک کے کنارے وضو کیا۔ایک جگہ سڑک کے کنارے لوگوں نے چٹائیاں بچھا رکھی تھیں۔ایک مصلیٰ بھی تھا۔ہم نے اجازت لے کر وہیں تین لوگوں کی جماعت بنائی۔نماز ختم ہوتے ہوتے پیچھے پانچ سات لوگ اور شامل ہو چکے تھے۔

نماز ختم ہوتے ہی ہم پھر لپکے۔ابھی ننگے پاؤں ہونے کی بھی فکر نہیں تھی ذہن میں ایک ہی بات تھی کہ مغرب کی نماز بھلے ہی ہو چکی ہے لیکن مغرب کا وقت تو ابھی باقی ہے۔اسی وقت کے اندر کنکر مار لینا چاہیے۔بھیڑ سے وحشت ہو رہی تھی لیکن راستہ بناتے ہوئے جب قریب پہنچے تو بڑی آسانی سے تینوں شیاطین پر کنکری ماری۔

جمراۃ کی عمارت میں گھستے گھستے آسمان ابر آلود ہو چکا تھا اور ہوائیں تیز ہو چکی تھیں۔ رمی سے فارغ ہوتے ہوتے اچھی خاصی آندھی بھی آ چکی تھی۔پولی تھین کے ہزاروں تھیلے ہوا کے ساتھ ساتھ بلند ہوتے جا رہے تھے اور جمراۃ کی اس چار منزلہ عمارت سے بھی اوپر اٹھ چکے تھے۔پھر بوندا باندی شروع ہوگئی۔اسی موسم میں ہم کو اپنے خیمے کا راستہ پکڑنا تھا۔اسی بیچ مسجد خیف میں عشاء کی اذان ہوگئی اور دیکھتے دیکھتے جماعت بھی کھڑی ہوگئی۔یہاں بھی امام نے دو رکعت نماز قصر پڑھائی۔ہم اپنے فیصلے پر قائم رہے کہ خیمے میں جا کر ہی نماز پڑھنی ہے۔

کچھ اندازے سے اور کچھ پوچھتے ہوئے بیچ بیچ میں ہونے والی ہلکی ہلکی بارش میں کہیں کہیں سر چھپاتے ہم بھاگتے رہے۔دکانیں بارش کی وجہ سے بند تھیں۔کہیں سے چپل بھی نہیں خرید سکے۔آٹھ بجے کے قریب اپنے خیمے میں پہنچے۔صبح آٹھ بجے سے رات آٹھ بجے کے بیچ کا یہ 12 گھنٹے کا وقت زندگی کے مصروف ترین لمحوں میں شمار ہوگا لیکن اطمینان تھا کہ آج کے سارے ارکان پورے ہوگئے۔حیرت یہ تھی کہ نہ بھوک لگی تھی نہ تھکاوٹ تھی۔ہم تینوں اس بات پر متفق تھے کہ یہ زمزم کی برکت ہے۔

آخری دعا

رات میں اپنے خیمے میں بیٹھے ہم ان لوگوں کے بارے میں اظہار تشویش کر رہے تھے جن کا اب تک کوئی پتہ نہیں تھا۔ کچھ لوگوں نے فون سے رابطہ کر لیا تھا اور وہ کسی محفوظ جگہ پر پہنچ چکے تھے۔ پھر بھی کچھ لوگوں کی اب تک کسی خبر کا نہ ملنا تشویش کا باعث تھا۔ کچھ تو دوبارہ گم ہو چکے تھے۔ ایک صاحب خیمے میں چھ گھنٹے بعد پہنچ گئے۔ یہاں سے طواف زیارت کرنے گئے تو وہاں پھر گم ہو گئے۔ ہم سوائے تشویش کے اور کیا کر سکتے تھے۔ ہاں دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کر رہے تھے کہ تھوڑا بہت بھٹکنا تو پڑا لیکن گم ہونے کی نوبت نہیں آئی۔

اسی دوران کل کا پروگرام بھی بن رہا تھا۔ طے ہوا کہ دوپہر میں پہلے کھانا کھا لیں پھر اول وقت میں ظہر پڑھ کر سب 12 ذی الحجہ کی آخری رمی کے لیے روانہ ہو جائیں۔ وہاں سے ادھر واپس نہ آ کر سب عزیزیہ کی رہائش گاہ پر پہنچیں۔ یہ سب کچھ طے ہو رہا تھا اور ساتھ ساتھ ایک اداسی، ایک اضمحلال، ایک سناٹا اور ایک بھاری پن بھی سب کو اپنی گرفت میں لیے جا رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ لوگ بولنے پر چپ رہنے کو ترجیح دے رہے تھے۔ ایک احساس تو سب کے دل میں یہ تھا ہی کہ اللہ اللہ کر کے سارے ارکان مکمل ہوتے گئے اب صرف آخری رکن رہ گیا جس کے پورا ہوتے ہی اس بھاگ دوڑ اور تگ و دو کا ثمرہ حج کی تکمیل کی شکل میں سامنے آئے گا، لیکن صرف اتنا ہی نہیں تھا ایک احتساب کی سی کیفیت بھی طاری تھی۔ ایام حج کے سارے مناظر نظر کے سامنے سے گذر رہے تھے ــــ کہاں کہاں صرف رسم ادائیگی ہوئی ــــ کہاں کہاں بغیر حضوری قلب کے صرف جسمانی حاضری ہوئی ــــ کہاں کہاں کیا کرنا چاہیے تھا اور کیا کیا کر سکتے

تھے جونہیں کر پائے ــــ کہاں کے لیے کون سی بات سوچ کر رکھی تھی جو ذہن سے نکل گئی ــــ کس کس نے کہاں کہاں پر خصوصی دعا کرنے کو کہا تھا، پتہ نہیں یاد رہا یا نہیں ــــ خدا جانے دوبارہ ایسا موقع ملے گا یا نہیں ــــ اگر ملا تو کیا کیا کریں گے ــــ وغیرہ، وغیرہ۔ بچا ہوا وقت اسی ادھیڑ بن میں کٹ رہا تھا۔

دوپہر میں بس آ گئی۔ سب کا سامان اس پر رکھ دیا گیا۔ معذور مرد اور کمزور عورتیں اس پر سوار کر دی گئیں۔ انہوں نے اپنے قریبی لوگوں کو اپنا وکیل بنایا کہ ان کی طرف سے آج تینوں شیاطین کو کنکر مار دیں۔ لوگ ایک ساتھ چلنے کے انتظار میں تھے اور چاہ رہے تھے کہ کوئی کسی سے نہ بچھڑے بلکہ سب ایک ساتھ عزیزیہ اپنی قیام گاہ پر پہنچیں۔ میں نے ارادہ ظاہر کیا کہ گھنٹے دو گھنٹے سواری کی تلاش میں ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ جمراۃ سے باہر نکل کر پیدل ہی عزیزیہ کی راہ پکڑ لیں۔ کئی لوگوں نے حمایت کی لیکن چلتے وقت میرے ساتھ صرف دو لوگ تھے، شیخ ایوب علی اور امین احمد۔ ان دونوں کو بھروسا تھا کہ میں صحیح راستہ معلوم کر کے اپنے ٹھکانے تک پہنچ جاؤں گا۔ اس بھروسے کی ایک وجہ انکے اندر خود اعتمادی کی کمی ہو سکتی ہے دوسری یہ کہ گزشتہ دن ہم تینوں ساتھ ساتھ رہے تھے۔

آج آخری رکن ادا کرنا تھا، ایسا رکن جس کے بغیر حج مکمل نہیں ہوتا۔ اگر چھوٹ گیا تو دم واجب ہوگا۔ اسی لیے بھیڑ شباب پر تھی۔ ہم تینوں قافلے سے قبل ہی روانہ ہوئے۔ وسیع و عریض راستے لوگوں کی کثرت سے تنگ تھے اور اکثر اوقات چلنے کے بجائے آگے والے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کھسکنا پڑتا تھا۔ اسی عالم میں جمراۃ کے قریب پہنچے۔ میں نے اسکیلیٹر کو ترجیح دی اور تیسری منزل پر چلا گیا۔ یہاں بھیڑ امید سے کافی کم تھی۔ بڑے ہی اطمینان سے ہم تینوں نے کنکر مارے۔

بھیڑ سے واسطہ نہیں پڑا تو اطمینان کی کیفیت تھی۔ ایسی حالت میں اپنے علاوہ بھی کچھ یاد آتا ہے۔ چھوٹے شیطان (جمرۃ الصغری) پر کنکر کا نشانہ لگاتے وقت گذشتہ دن کا بس کا سفر، پاکستان والے وکیل صاحب اور ان سے ہوئی گفتگو یاد آئی۔ میں نے کنکر مار کر دعا کی —

''یا اللہ! اس پاک اور مقدس سرزمین سے نسلی بادشاہت کو ختم کر
اور عوامی حکومت کی کوئی ایسی شکل رائج کر جو دنیا میں نمونہ بن سکے۔ آمین!''

یہی دعا منجھلے شیطان (جمرۃ الوسطی) کے پاس بھی کی۔ بڑے شیطان (جمرۃ الکبری) کے پاس کوئی دعا نہیں کی جاتی ورنہ وہاں بھی کرتا۔ دیکھیں اللہ یہ دعا کب پوری کرتا ہے۔

باہر نکلنے والا سیلاب غیر متوقع نہیں تھا۔ پیدل چلنا مشکل تھا۔ وھیل چیئر تو رکی پڑی تھیں ایسے میں سواری کہاں سے چلتی۔ بڑے مجمع کے ساتھ چلنے میں محنت کم ہوتی ہے، آپ نہیں بھی چلنا چاہتے تو لوگ آگے بڑھا دیں گے۔ ہاں نیچے گرنے کی غلطی نہ ہو، ورنہ اوپر اٹھ جانے میں کوئی دیر نہیں لگے گی۔ اس میں سب سے زیادہ شامت ہوائی چپلوں کی تھی۔ پیچھے والے کا پیر پڑا اور فیتہ باہر ہو گیا۔ اب کس کی ہمت ہے کہ جھک کر اٹھائے اور اسے درست کرے۔ راستے میں تقریباً ایک کلومیٹر لمبی سرنگ تھی اس سے باہر آتے ہی چپل بیچنے والے موجود تھے۔ خمسہ ریال، خمسہ ریال۔ معمولی، سستی اور ہلکی چپل۔ لیکن ننگے پیر والوں کے لیے اس وقت یہی نعمت تھی۔

کنکر مارتے وقت ہی تیز ہوا اٹھی تھی اور آندھی کے آثار تھے۔ بادل بھی امنڈ رہے تھے اب جا کر بوندا باندی شروع ہوئی۔ ابھی آدھا راستہ باقی تھا۔ خیر ہوئی کہ پیدل راستے پر ایک ایک کلومیٹر لمبے شیڈ دھوپ پانی سے محفوظ رہنے کے لیے بنائے ہوئے ہیں۔ بارش کے زور پکڑتے پکڑتے ہم اسکے نیچے پہنچ چکے تھے۔ اب تیز ہوا کے ساتھ چھینٹے ضرور آرہے تھے لیکن شرابور ہونے

سے بچ گئے۔ ویسے شرابور ہونے والوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔ بارش لگ بھگ ڈیڑھ گھنٹہ چلی۔ اس دوران ہم لوگ مجمع کے ساتھ ساتھ آگے رینگتے رہے، شیڈ سے باہر آنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس کے بعد بھی گرچہ ہلکی بوندا باندی جاری تھی لیکن ہم کچھ اندازے سے اور کہیں کہیں راستہ پوچھتے ہوئے صحیح سلامت عزیزیہ کے اپنے ٹھکانے تک پیدل پہنچ گئے۔ رات تک پتہ چلا کہ کئی لوگ آج بھی گم ہو گئے۔ ایک پینسٹھ سالہ حضرت کو جب اپنی اہلیہ کی گمشدگی کا پتہ چلا تو وہ ان کو ڈھونڈنے نکل پڑے۔ اہلیہ تو چار گھنٹے میں مل گئیں وہ چھتیس گھنٹے تک غائب رہے۔

یہاں عام طور پر اتنی بارش نہیں ہوتی لیکن اس سال حج کے آس پاس دو بار بھرپور بارش ہوئی اور ایک بار ہلکی۔ تقریباً ہر شخص کچھ نہ کچھ بھیگا تھا اور زیادہ تر لوگوں پر اس کے اثرات ظاہر ہوئے۔ سردی، کھانسی، چھینک، بخار وغیرہ۔ میں ہومیو پیتھ کی چار پانچ دوائیں ساتھ لایا تھا لیکن کوئی ایسی نہیں تھی جو سردی میں کام آتی۔ آخر کوئی کتنی دوائیں ساتھ لا سکتا ہے۔ دوا بھی کھائی لیکن ایمان کی بات ہے کہ فائدہ زمزم سے ہی ہوا۔

السرایا الثریا

حج کے وہ پانچ دن گزر چکے تھے۔ سب کی حالت اب تک خستہ تھی جو لوگ اوپر سے چاق وچوبند تھے وہ بھی اندر سے ہلے ہوئے تھے۔ سردی، بخار، کھانسی، پیر کا درد، تھکاوٹ، چپل سے پیر چھل جانا وغیرہ، وغیرہ، میں سے کچھ نہ کچھ سب کے حصے میں آیا تھا۔ دو تین دن تھکاوٹ اتارنے اور پوری طرح نارمل ہونے میں گزر گئے۔ اب سب کو فکر تھی کہ جلد سے جلد حرم کے آس پاس منتقل ہو جائیں۔ یہاں سے حرم آنا جانا عموماً پریشان کن تھا۔ بسیں ہٹ چکی تھیں اب ٹیکسی کا ہی بھروسہ تھا جن کا کرایہ دوریال سے دوسوریال تک کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ پھر آنے جانے میں وقت بھی بہت لگتا تھا۔ بالاخر 25 نومبر کو اعلان ہوا کہ آج ظہر کی نماز اور کھانے کے بعد حرم کے پاس کے ہوٹل میں چلنا ہے۔ سب کے چہرے پر بہار آ گئی۔ بس پر سامان بار کرنے، سوار ہونے، پہنچنے، سامان اتارنے اور کمرے کا نمبر جاننے میں عصر کا وقت ہو گیا۔

یہ ہوٹل السرایا الثریا ہے۔ حرم کے تقریباً سامنے۔ باب عبدالعزیز سے نکل کر سیدھے آگے بڑھنے پر سامنے ہوٹل اجیاد مکہ مکارم کی پشت پر یہ چھوٹا سا گیارہ منزلہ ہوٹل ایک چھوٹی سی پہاڑی کے کنارے ایک راکٹ کی طرح کھڑا ہے۔ اذان میں دس منٹ کی تاخیر تھی لیکن سڑک پر جس طرح لوگوں کا تانتا مسجد کی سمت بندھا ہوا تھا اس کی وجہ سے جگہ حاصل کرنا دشوار لگ رہا تھا۔ سامان ہوٹل کی لابی میں چھوڑ کر حرم کی طرف چلا۔ آگے بڑھتے ہی مفتی صاحب ساتھ ہو گئے۔ سامنے کے دروازے پر اژدہام اور صحن میں یہاں سے وہاں تک صف بچھا کر بیٹھ چکے لوگوں کی ایک جھلک دیکھتے ہی مفتی صاحب بولے۔۔۔ ''اوپر چلیے نیچے جگہ ملنی مشکل ہے''۔

وہی آگے چلے اور اس طرف بڑھے جدھر اسکیلیٹر تھا۔ ہم اذان ہوتے ہوتے چھت پر پہنچ چکے تھے۔ یہاں بھیڑ تو تھی لیکن جگہ بھی وافر تھی۔ آرام سے نماز ادا کی۔

خانہ کعبہ اور مسجد حرام کی ہر سطح کا اپنا ایک الگ لطف ہے۔ نیچے مطاف اور اس کے اردگرد کا ایک الگ ماحول ہے۔ وہاں بیٹھا ہوا انسان ہر لحظہ اس انتظار اور امید میں رہتا ہے کہ اچانک کسی وقت کسی طرح اس کے اور کعبہ کے بیچ طواف کر رہے انسان ہٹ جائیں گے اور وہ دوڑ کر کعبہ کو چھو لے گا، حجر اسود کو چوم لے گا، ملتزم سے لپٹ جائے گا یا حطیم میں نیت باندھ کر کھڑا ہو جائے گا۔ پہلی منزل پر اضطراب آمیز ٹھہراؤ ہے۔ آپ سامنے بھی ہیں اور دوری بھی ہے۔ نیچے ذرا جگہ خالی دکھائی دے تو بھاگ کر چلے جائیں۔ جب تک نہیں جا رہے ہیں تب تک دور کا جلوہ ہی سہی لیکن اوپر چھت کا معاملہ ہی کچھ اور ہے۔

چاروں طرف کھلا ہوا ماحول، مسجد حرام کے سارے مینار نگاہوں کے سامنے ہیں، ریلنگ کے قریب چلے گئے تو کعبہ کے گرد منڈراتے ہوئے پروانوں کا دلکش نظارہ گھنٹوں تک سیر نہیں ہونے دیتا۔ جگہ اتنی وافر ہے کہ نیچے کی منزل سے زیادہ لوگ یہاں نماز پڑھ لیتے ہیں کیوں کہ بیچ بیچ کے سیکڑوں پائے جگہ نہیں گھیرتے۔ کھلی فضا، تازہ ہوا اور پرسکون کیفیت۔ ظہر میں یہاں دھوپ ہوتی ہے لیکن بقیہ چار وقتوں میں چھت کی رونق کا عالم ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ بلکہ جس کو چھت راس آجائے اس کو کسی اور جگہ قرار نہیں ملے گا۔ طواف یا نماز کے بعد چاروں طرف بے ترتیبی سے پھیلے ہوئے لوگ، چاروں طرف ریلنگ سے سٹ کر کھڑے یا بیٹھے ٹکٹکی باندھے بیت اللہ کو تکتے دیوانے اور دیوانہ وار طواف میں مصروف جانثار۔ یہ ایسا سماں ہے جو گھنٹوں وہاں بیٹھنے پر بھی اکتاہٹ نہیں پیدا ہونے دیتا۔ یہاں حرم کے نزدیک منتقل ہونے کے بعد پہلے دن اور پہلے وقت سے ہی یہ جگہ کچھ ایسی بھا گئی کہ اس کے بعد گرچہ بیسمنٹ سے لیکر پہلی منزل تک

ہر جگہ نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا لیکن مطاف (اگر بھیڑ کم ہو) کے بعد پہلی پسند یہ کھلی چھت ہی رہی۔ زمزم پینے اور وضو کرنے کے لیے بھی چھت پر بھیڑ عموماً کم ہی ہوتی ہے۔

حج کے زمانے میں لوگ عموماً اپنے وقت کا پورا مصرف نماز، طواف، ورد و وظائف اور دعاؤں میں لیتے ہیں۔ زیادہ تر لوگوں کا معمول ہے آنکھیں نیچی کیے ایک ہی دروازے سے وقت معین پر داخل ہونا روزانہ ایک ہی جگہ یا اس کے آس پاس بیٹھنا اور اپنے وقت مقررہ پر اسی دروازے سے نکل کر اپنی اقامت گاہ کی طرف بڑھ جانا۔ کچھ لوگ ہم جیسے ہوتے ہیں جن کے پاس بہت وقت ہوتا ہے اور ہم اس کا مصرف اسی قسم کی چھان بین میں لیتے ہیں۔ میں نے دوسرا حج کر رہے لوگوں کو جب اوپر کی چھت پر پہنچایا اور وہاں انہوں نے تھوڑا وقت گزار لیا تو افسوس کرتے رہے کہ کاش وہ پہلے سے یہیں بیٹھا کرتے۔

بیسمنٹ بھی ایک الگ دنیا ہے۔ مطاف کو چھوڑ کر اس کے چاروں طرف جو مسجد ہے اس کے نیچے زیرِ زمین منزل بھی ہے جس کی وجہ سے بڑی راحت ہے۔ عموماً جس وقت اوپر بھیڑ کی وجہ سے صفوں میں دو لوگوں کے بیچ گھسنے کی جگہ بھی نہیں ہوتی یہاں آ کر آپ تھوڑی دیر لیٹ سکتے ہیں۔ زمزم یہاں بھی ہے واٹر کولروں میں بھی اور نل میں بھی۔ جس کے ذہن میں مسجد حرام کا نقشہ ہو وہ نیچے نیچے جا کر بڑی آسانی سے اپنی پسند کی جگہ پر باہر نکل سکتا ہے۔ نیچے سے اسکیلیٹر اور لفٹ کے ذریعہ کسی بھی منزل پر جایا جا سکتا ہے۔ ویسے صرف یہی ایسا علاقہ ہے جہاں کبھی کبھی اُمس کا احساس ہوتا ہے۔

اردو ہے جس کا نام

جب تک ہم عزیزیہ میں رہے تب تک حرم شریف کی آمد و رفت وقفہ وقفہ سے ہوتی تھی۔ دو چار لوگوں کا شوق بڑھا، نکل گئے۔ دو تین وقت کی نماز پڑھ کر واپس آگئے۔ اس وقت تک سب کے لیے حرم دور کی چیز تھی۔ لوٹنے والا یہ ذکر ضرور کرتا کہ فلاں گیٹ سے اندر گئے تھے، دھیان کر کے اسی گیٹ سے واپس نکلے اور کس طرح ٹیکسی والے سے مول جول کیا۔ کیسے اپنے علاقے کی نشانیوں کو پہچان کر صحیح جگہ اتر گئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہاں پہنچتے ہی لگا جیسے سب کے پر نکل آئے۔ لوگ دوسرے دن سے ہی اس پورے علاقے کی جانکاری پر تبادلہ خیال کرنے لگے۔ فلاں گیٹ کے سامنے چائے اچھی ہے۔ فلاں گیٹ کے سامنے ٹوپی سستی ملتی ہے۔ ادھر سے جاؤ تو ہمیشہ جگہ اچھی ملے گی۔ ٹیلیفون پر گھر والوں اور دوستوں کو اطلاع دے رہے ہیں — ''حرم کے سامنے ہوٹل میں ٹھہرے ہیں، کھڑکی سے باب عبدالعزیز دکھائی دیتا ہے، جانے میں پانچ منٹ لگتا ہے، تیزی سے جاؤ تو تین منٹ۔'' یہاں تیرہ دن کا قیام گویا حاصل زندگی ہے۔

یہ ہوٹل جس پہاڑی کی جڑ میں واقع ہے وہ جبل اجیاد ہے۔ ہمیں یہاں آئے ہوئے تین چار دن ہوئے تھے کہ ہوٹل اور پہاڑی کی درمیانی جگہ میں کام شروع ہو گیا۔ بڑے شاول (Shovel) اور اکسکیویٹر (Excavator) لگے تھے اور ٹوٹتے ہوئے پتھر ہٹا کر سطح چورس کی جا رہی تھی۔ عنقریب یہاں کوئی بیس پچیس منزلہ ہوٹل کھڑا ہو کر چاروں طرف پھیلے ہوٹل صفوہ رائل آرکیڈ، ہوٹل ایلاف، دارالایمان، دارالتقویٰ، ہوٹل اجیاد مکہ مکارم جیسے بڑے بڑے ہوٹلوں کے قبیلے میں شامل ہو جائے گا۔

ملک عبدالعزیز گیٹ سے سامنے بڑی تعداد میں بیت الخلا بنے ہوئے ہیں۔اس سے بائیں طرف محلّہ مسفلہ ہے۔اس میں گھستے چلے جایئے۔بکثرت ہندوستانی، پاکستانی، بنگلہ دیشی ملیں گے۔کسی دوکان پر اردو یا بنگلہ بولتے ہوئے خریداری کیجیے۔میں تو سامنے والے کے چہرے مہرے کا اندازہ کر کے اردو شروع کرتا تھا لیکن اسد احمد صاحب تو بلا امتیاز اردو میں ہی اپنا مدعا دوکاندار سے کہتے اور جواب ہمیشہ امید کے مطابق ملتا، خواہ چہرے سے کسی ملک کا لگتا ہو۔

مسفلہ ایک چھوٹی سی پہاڑی پر بسا ہوا محلّہ ہے۔کبھی یہیں کہیں حضرت بلال ؓ کو دھوپ میں لٹا کر ان کے سینے پر ان کا مالک، امیہ بن خلف وزنی پتھر رکھ دیتا تھا اور وہ احد، احد کہتے کہتے بے ہوش ہو جاتے تھے۔آج یہاں اونچی نیچی سیکڑوں گلیوں میں ہزاروں کثیر منزلہ عمارتیں ہیں جن میں گنجائش سے زیادہ حاجی ٹھہرائے جاتے ہیں اور آس پاس ایک بڑا بازار ان کو لبھانے اور للچانے میں مصروف ہوتا ہے۔شارع اجیاد سے مسفلہ کے درمیان ایسی کئی دوکانیں ہیں جہاں سے ——'ہر مال دو ریال'—— ''ہر مال تین ریال''—— ''ہر مال دس ریال'' ——وغیرہ کی آوازیں بلند ہوتی رہتی ہیں۔میں ترجمہ کر کے نہیں کہہ رہا، واقعی یہی آوازیں آتی ہیں۔دکان داروں نے چار پانچ زبانوں میں یہی بات رکارڈ کر رکھی ہے جن میں ایک اردو بھی ہے۔گاہکوں کی بڑی تعداد یہی زبان بولتی ہے۔ویسے حرم شریف کے علاقے میں اکثر ہدایات یا اطلاعات اردو میں بھی لکھی دکھائی دیتی ہیں۔بلکہ اکثر یہ تین زبانوں میں ہوتی ہیں جن میں عربی اور انگریزی کے بعد اردو کا استعمال ہوتا ہے۔آپ کو جگہ جگہ پر:

—— حمام و بیت الخلا	—— صرف وضو کرنے کے لیے
—— پینے کے لیے	—— سعی کی طرف
—— سعی کا راستہ	—— پہلی منزل اور دوسری منزل جانے کا راستہ

—— زمزم کا پانی —— آبِ زمزم

—— اپنے جوتے چپلوں کی حفاظت کے لیے ایک تھیلی میں انکو اپنے ساتھ رکھیں

—— یہاں پر اپنی ذاتی چیزیں نہ رکھیں، یہاں سے اٹھالی جائیں گی

——وغیرہ تحریریں دکھائی دے جاتی ہیں۔ کہیں کہیں الیکٹرانک بورڈ پر تحریری ہدایتیں آتی رہتی ہیں۔ ان پر بھی چار پانچ زبانوں میں ایک اردو ضرور ہوتی ہے۔ حرم کے باہر لگے لاؤڈ اسپیکر سے بھی دو تین زبانوں کے ساتھ اردو میں بھی اس طرح کے اعلان کیے جاتے ہیں——

''معزز حجاج کرام۔ اللہ آپ کا حج قبول فرمائے! براہ کرم آنے جانے کے راستوں پر صف بنا کر نہ بیٹھیں۔ اس سے حرم شریف کے اندر جانے والوں کو تکلیف ہوتی ہے۔''

دکانوں پر بھی—— سونے اور زیورات خریدنے کا مرکز—— ہندوستانی پاکستانی کھانوں کا مرکز ——وغیرہ لکھا دکھائی دیتا ہے تو خوشی ہوتی ہے لیکن جب حرم میں ہی کہیں—— ''نیچے جانے کی راستہ'' جیسے جملے دکھائی دیتے ہیں تو افسوس بھی ہوتا ہے۔ اردو جاننے والے بڑی تعداد میں یہاں ملازم ہیں اور اپنی زبان کے معاملے میں ایسی بے توجہی؟ منیٰ میں بھی جمرۃ کے پاس حاجیوں کے سامان وغیرہ رکھنے کی جگہ پر عربی میں مرکز حفظ الاعتمتہ لکھا تھا اور اردو میں تھا —— 'مرکز کا سامان رکھ کر'۔

وہ چہرے یاد آتے ہیں

دنیا میں اتنی زبانیں بولنے والے حج کے علاوہ اور کہیں اکٹھے نہیں ہوتے۔ راستہ چلتے، وضو کرتے، زمزم پیتے یا کسی دوکان کے باہر کھڑے ایک سو لوگوں سے سوال کیجیے کم از کم پچاس زبان بولنے والے ملیں گے۔ بسوں پر آتے جاتے یا صفوں میں آس پاس بیٹھے لوگ کبھی ضرورتاً اور کبھی شغل کے طور پر ایک دوسرے کا ملک اور انکی زبان کی جانکاری حاصل کرنے کے شائق رہتے ہیں۔ ایسے میں اپنے لسانی افلاس کا خوب خوب اندازہ ہوتا ہے۔ ہندوستانی زبانوں کو چھوڑ دیں تو سوائے انگریزی اور فارسی کے کوئی اپنے پلے نہیں پڑتی۔ یہ دونوں بھی پڑھنے لکھنے کی حد تک، جب اہل زبان روانی سے بولتے ہیں تو یہ تمیز مشکل ہو جاتی ہے کہ یہ کون سی زبان ہے۔

ایرانی اکثر ٹکراتے رہے۔ کچھ نہ کچھ گفتگو ہوتی رہی۔ فردوسی، حافظ، سعدی، وغیرہ کا نام لے لینا ہی ان کے خوش ہونے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ ایک دن بس میں پاس کی سیٹ پر بیٹھے شخص نے میرے ساتھ بیٹھے ایوب صاحب سے ہاتھ کا سوالیہ اشارہ کرتے ہوئے پوچھا ـــــ

''وطن؟''

انہوں نے کہا ـــــ ''انڈیا، انڈیا، الھند''

اس نے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے سروں کو ملا کر حلقہ بنایا اور کہا ـــــ

''او! ہندا! سوپر!!'' ـــــ یہ شخص ترکی تھا۔

ایک دن بس میں ہی ایک شخص کی آنکھوں میں اپنائیت کے آثار دیکھ کر میری دلچسپی جاگی۔ اس سے وطن پوچھا۔ اس نے کہا ـــــ سوریا

میں نے پوچھا— سیریا؟

اس نے اقرار میں سر ہلاتے ہوئے کہا — سوریا

میں نے اپنی جانکاری ظاہر کرتے ہوئے دارالسلطنت کا نام لیا— دِمِشق

اس کا جواب اقرار میں تھا، لیکن اس نے کہا — دَمَشق

میں سیریا اور دمشق (م کو زیر کے ساتھ) بولنے کا عادی ہوں۔ جھینپ مٹانے کے لیے میں نے پھر اپنی جانکاری کا ثبوت دیا — حافظ الاسد

اس نے سر ہلایا میں نے اس کے بیٹے کا نام لیا— بشار الحافظ

اس نے پھر سر ہلایا، ادھر ادھر دیکھ کر میری طرف جھکا اور بولا —

حافظ الاسد احمدی

یہ کہ کر اس نے دونوں ہاتھوں کی شہادت کی انگلیاں موڑیں اور ایک دوسرے میں پھنسا کر ایک اشارہ کیا تو واضح ہو گیا کہ اس کے عقاید کی وجہ سے عوام کا ایک طبقہ اس کے خلاف ہے۔

ایک دن پیدل چلتے ہوئے ایک پاکستانی سے خاصی دیر تک گفتگو ہوئی۔ وہ پیشے سے انجینئر اور نسلاً پختون تھا۔ میرے منھ سے بادشاہ خان کا نام اور ان کے لیے تعریفی کلمات سن کر کھل اُٹھا۔ دیر تک پاکستان کی سیاست پر گفتگو ہوئی۔

ایسے واقعات روز ہوتے ہی رہے لیکن شریف اللہ ہمیشہ یاد آئیں گے۔ میں نے ان کو پاکستانی سمجھا اور انہوں نے مجھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ افغانی ہیں۔ اردو ٹھیک ٹھاک بول رہے تھے لیکن ان کا کہنا تھا کہ وہ انگریزی میں ہی comfortable ہیں۔ ہم چھت پر تھے اور عصر کے وقت جو جگہ حاصل ہوئی تھی اس کو چھوڑ کر اٹھنے کا ہم دونوں میں سے کسی کا ارادہ نہیں تھا۔ کم از کم

مغرب تک تو یہیں جمے رہنا تھا ورنہ سیکڑوں لوگ اچھی جگہ کے لیے ادھر ادھر نظریں دوڑا رہے تھے۔ تعارف ہوا اور دو نمازوں کے درمیانی وقفے میں خاصی گفتگو رہی۔ معلوم ہوا قندھار میں مدرس ہیں اور ایک اخبار کے نمائندہ بھی۔ منموہن سنگھ کو جانتے تھے۔ موجودہ صدر کو نہیں جانتے۔ ابھی تک عبدالکلام کو صدر سمجھ رہے تھے۔ ہندوستان میں دلی، کولکاتا، ممبئی، بنگلور وغیرہ کا نام جانتے تھے۔ جمشید پور نہیں جانتے تھے لیکن ٹاٹا کا نام سنتے ہی سمجھ گئے۔ وہ ٹاٹا کی بسوں اور ٹرکوں سے واقف تھے۔ طالبان، ملا عمر، کرزئی، روس، امریکا وغیرہ پر تفصیلی گفتگو رہی۔ ان کے خیالات بہت حد تک میرے خیالات سے مشابہت رکھتے تھے لیکن ان کا اظہار مناسب نہیں۔ میں تو نہیں وہ کسی پریشانی میں پڑ سکتے ہیں۔

افغانستان کے حوالے سے وہ عمر دراز شخص بھی بھلائے نہیں بھولتے جو جلال آباد سے آئے تھے اور جنہوں نے مجھے مخاطب کر کے حج میں پوشیدہ اللہ کی حکمت پر فصیح و بلیغ پشتو میں طویل تقریر کی۔ بیچ بیچ میں فارسی کے الفاظ کی وجہ سے میں مفہوم سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر وہ مجھ سے غالباً ہندوستان کے سیاسی حالات پوچھنے لگے۔ منموہن سنگھ، سونیا گاندھی وغیرہ تو سمجھ میں آیا لیکن ان کا سوال قطعی پلے نہیں پڑا۔ پھر خدائی مددگار بن کر محمد انعام خاں نازل ہوئے جو انگلش میں ایم. اے. ہیں، ایم. ایڈ. ہیں اور کوہاٹ کے پاس کرک میں ایک اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں۔ وہ اردو اور پشتو دونوں میں رواں تھے اور دیر تک مترجم کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ یہ انکا ساتواں حج تھا۔ انہوں نے ہی مجھے بتایا کہ —— ''یہ سامنے بادشاہ کے محل کی جنوبی دیوار پر دو کھڑکیوں کے سے نشان دیکھ رہے ہیں نہ، یہیں پر اس بوڑھی عورت کا مکان تھا جو روز حضور ﷺ پر کوڑا کرکٹ پھینکتی تھی اور ایک دن ناغہ ہونے پر رحمت عالم ﷺ اس کی مزاج پرسی کو چلے گئے تھے۔''

مامتا کا نور

بیت اللہ اور اس کے ارد گرد کا سرکاری عملہ صرف عربی بولتا ہے اور کبھی ٹوٹی پھوٹی اردو۔ مثلاً ـــ سیدھے۔ آگے۔ پیچھے۔ جاؤ۔ چلو۔ ہٹو۔ راستہ وغیرہ۔ اور کسی زبان کے الفاظ میں نے ان سے نہیں سنے۔ اس کے باوجود وہ زبان سے زیادہ ہاتھ کے اشارے، چہرے کے تاثرات اور آواز کے اتار چڑھاؤ سے اپنی بات کافی حد تک واضح کر دیتے ہیں۔

ان کارندوں میں کچھ وردی والے ہوتے ہیں اور کچھ مخصوص لمبے عربی کرتے یا 'توپ' پہنے اور سر پر سفید لال چار خانے کا بڑا رومال باندھے، کبھی عقال کے ساتھ اور کبھی بغیر عقال کے۔ یہ نہ خوش مزاج ہوتے ہیں نہ بد مزاج بلکہ اکثر مشینی انداز میں اپنے کام انجام دیتے ہیں لیکن کوئی ان کی ہدایت کی ان دیکھی یا ان سنی کر دے تو جھڑکتے ہیں۔ عورتوں کے ساتھ ان کا رویہ عموماً درشت ہوتا ہے۔ ویسے کچھ خواتین بھی سیاہ برقعے، سیاہ موزے اور سیاہ دستانے میں ملبوس ہوتی ہیں جو عورتوں پر نگاہ رکھتی ہیں۔ اس 'بلیک فورس' سے عورتوں کو عموماً شکایت رہتی ہے۔ کئی عورتوں کے منھ سے سنا کہ ان کے بیگ یا پرس انہوں نے چیک کیے۔

مطاف کے علاوہ ہر جگہ سے عورتوں کو ہٹانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کوشش ہوتی ہے کہ یہ نماز کے وقت مسجد الحرام خالی کر دیں لیکن یہ ہو نہیں پاتا۔ یہ اندر ہی کہیں ایک جگہ ہزار دو ہزار اکٹھا ہو جاتی ہیں پھر وہ بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ بعض عورتیں تو صفوں کے درمیان بیٹھی رہتی ہیں۔ 'حرام'، 'ناجائز' وغیرہ صدائیں سن کر بھی ان کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ کوئی نہ کوئی صفوں میں سے کہتا بھی ہےـــ ''چلی جاؤ، نہ تمہاری نماز ہوگی نہ آس پاس کے مردوں کی ہوگی۔'' لیکن کیا مجال جو کوئی اپنی جگہ

چھوڑے۔ بیت اللہ کے احاطے میں نماز پڑھنا وہ بھی خانہ کعبہ سے قریب، اس لالچ کے آگے سارے فتوے اور مسئلے دھرے رہ جاتے ہیں۔ میں نے تو ہر نماز کے بعد ہونے والی جنازے کی نماز میں بھی عورتوں کو نیت باندھ کر کھڑے دیکھا ہے۔ یہ نظارہ یہاں کے علاوہ کہیں اور دیکھنے کی امید نہیں ہے۔ ان عورتوں سے اکثر لوگوں کو دوران طواف یا نماز کے اوقات میں شکایت رہتی ہے مجھے بھی رہی۔ لیکن اس دن جمعہ کی نماز کے وقت ایک عورت نے بہتوں کی سوچ کا زاویہ بدل کر رکھ دیا۔

ہم لوگ ایک گھنٹہ پہلے سے بیٹھے تھے اور بڑی اچھی سایہ دار جگہ تاک کر بیٹھے تھے۔ لیکن اذان کا وقت ہوتے ہوتے سورج کا زاویہ بدل چکا تھا۔ ہم براہ راست کرنوں کی زد میں آگئے اور دل میں کہہ رہے تھے کہ آج امام کعبہ زوال کا وقت ختم ہونے سے قبل بھی جمعہ پڑھا دیں تو کوئی حرج نہیں۔ نومبر کی 26 تاریخ کو بھی یہاں بیٹھے بیٹھے میر انیسؔ کے مرثیوں کے بند یاد آرہے تھے۔ اسی وقت دو صف آگے سے ایک عورت اپنے ہاتھ میں پانی کا ایک گیلن اور ہاتھوں میں پلاسٹک کے ڈسپوزیبل گلاس لیے کھڑی ہوئی۔ گھنٹے بھر سے ــــ 'عورتیں پیچھے چلی جائیں نماز خراب ہوتی ہے'، 'منع ہے، پھر بھی آجاتی ہیں'، 'ان کو کوئی نہیں سمجھا سکتا' ــــ وغیرہ جملے بولنے والے اب پر امید نظروں سے اس سنجیدہ، حلیم، بردبار، صحتمند اور پروقار عورت کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ایک ایک گلاس کر کے وہ گیلن ختم ہوا پھر دوسرا گیلن۔ تب تک خطبے کی اذان ہوگئی۔

عادت کے مطابق میں نے قومیت کا اندازہ کرنے کی کوشش کی لیکن چہرے پر پھیلے آفاقی تقدس اور گول چشمے کے پیچھے سے جھانکتی پرسکون آنکھوں میں مامتا کے نور نے ہر طرح کی سرحدوں کو مسمار کر دیا۔ مجھے حضرت ہاجرہؓ یاد آرہی تھیں جو اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ساتھ یہاں رکنے والے قافلوں کو زمزم پلاتی رہی ہوں گی۔ وہ صحابیات بھی یاد آرہی تھیں جو غزوات میں مجاہدوں کو پانی پلاتی تھیں اور ان کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔

جتنے حاجی اتنے مفتی

حج سب کا ہو چکا تھا۔لیکن کئی لوگوں کو دم لگا تھا۔ان کا کوئی نہ کوئی رکن چھوٹ گیا تھا یا وقت پر ادا نہیں ہو پایا تھا۔ان کو دم یعنی قربانی دینی پڑی۔ کچھ نے چھوٹی موٹی غلطی کی تو صدقہ فطر کی مقدار میں صدقہ دے کر چھٹکارا ہوا۔ کچھ کا معاملہ بہت معمولی سی بھول کا تھا۔ان کو چھوٹی موٹی رقم صدقہ کر کے اطمینان ہو گیا۔ اس دوران مفتی صاحب کو لوگوں نے بہت مصروف رکھا۔کچھ لوگ ایک ہی مسئلہ بار بار پوچھتے اور کسی نئے جواب کی امید کرتے۔ایک صاحب پر حالات کے پیش نظر دم واجب تھا۔ انہوں نے مفتی صاحب سے پوچھنے کے بعد اپنے اپنے علاقے کے کسی عالم سے فون کر کے مسئلہ پوچھا۔ان کے سامنے پوری صورت حال نہیں تھی۔ جس طرح انہوں نے اپنا معاملہ رکھا ہوگا ،وہی انکے علم میں آیا۔انہوں نے انکی امید کے مطابق دم سے بری کر دیا۔

یہ سارے ہنگامے کئی دنوں تک چلتے رہے اور اسی دوران یہ اندازہ ہوا کہ یہاں جتنے حاجی ہیں گویا اتنے مفتی بھی ہیں اور جس نے پہلے بھی حج کر رکھا ہے وہ تو بزعم خویش 'مفتی اعظم' ہے۔ سارے مسائل کا من چاہا حل ان کی زبان پر موجود رہتا تھا۔آپ کی بات ابھی آدھی بھی نہیں ہوئی اور انہوں نے کہا— ''سمجھ گئے، سمجھ گئے۔کوئی گھبرانے کی بات نہیں۔ اللہ نیت دیکھتا ہے۔آپ نے جان بوجھ کر تو ایسا نہیں کیا۔''

اب آپ کہہ رہے ہیں— نہیں نہیں آپ میری بات سن تو لیجیے۔'' اور وہ کسی دوسرے شخص کی طرف دیکھ کر فرما رہے رہے ہیں— ''ارے ایسا بہت ہوتا ہے۔پچھلی بار بھی جب ہم

دو ہزار آٹھ میں آئے تھے تو.........."

— "پچھلی بار بھی ایک آدمی کی قربانی نہیں ہو سکی تھی۔ اس نے احرام بھی کھول دیا تھا۔ پھر اس نے بعد میں قربانی کا پیسہ جمع کر دیا۔ سب ٹھیک ہو گیا۔ اللہ نیت دیکھتا ہے۔"

— "صدقہ کرنا ہے تو گھر جا کر کیجیے گا۔ یہاں کس کو دیجیے گا۔ جس کو دینے جائیے گا آپ سے زیادہ پیسے والا نکلے گا۔ ہا ہا ہا......."

— "اللہ کے یہاں قربانی کا خون اور گوشت نہیں پہنچتا، نیت پہنچتی ہے۔ آپ تو نیت کر کے ہی آئے تھے۔ پیسہ اب جمع کرا دیجیے۔ کوئی بات نہیں۔"

اگر کسی نے کہا کہ مفتی صاحب تو ایسا کہ رہے ہیں یا کتاب میں تو ایسا لکھا ہے تو کوئی آواز آئی: — "ارے مولوی مولانا کے چکر میں نہ پڑیے۔ جو آپ کے دل کو اچھا لگے وہی کیجیے۔ دل صاف رہنا چاہیے۔"

حالانکہ اسی فیصد لوگوں کے سارے ارکان وقت پر ہو گئے تھے اور بظاہر کہیں پر کوئی غلطی نہیں ہوئی تھی لیکن یہ بات بھی سامنے آئی کہ احتیاط کا تقاضہ ہے کچھ نہ کچھ صدقہ کر دیا جائے ۔ صدقہ ردِ بلا ہے، صدقہ غلطیوں کا ازالہ ہے، صدقہ بگڑے کام بنانے کا ذریعہ ہے وغیرہ ،وغیرہ۔ زیادہ تر لوگوں نے ایسا ہی کیا بھی۔

صدقہ لینے والوں کی کمی نہ منیٰ میں تھی نہ مکہ میں۔ البتہ یہاں ایشیائی اور افریقی برابر ہو گئے۔ ہاں ایک فرق ہے۔ بیشتر ایشیائی ممالک (یعنی ہندوستان پاکستان بنگلہ دیش وغیرہ) کی عورتیں سڑکوں کے کنارے کھڑی رہتی ہیں جبکہ افریقی زیادہ تر بچوں کا استعمال کرتے ہیں۔ ایک ہاتھ ایک پیر یا دونوں ہاتھ یا پیر سے معذور بچے چار پانچ کی تعداد میں سڑک کے بیچوں بیچ بیٹھتے اور مختلف زبانوں میں صدائیں دے کر متاثر کرتے ہیں۔ تھوڑی دیر غور کرنے پر ان کے آس

پاس کوئی نہ انکی نگرانی میں دکھائی دے سکتا ہے۔ یہ سارا معاملہ مجھے ایک ریکٹ کی طرح لگا۔ ایسے معذور بچوں کو حاصل کرنا اوران کو مناسب وقت اور مناسب جگہ پر بیٹھا کراپنی آمدنی بڑھانا۔ بالکل منصوبہ بند طریقے پر سارا کام ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

اسد صاحب نے حسب معمول سو بات کی ایک بات کہ دی —— ''صدقہ کی رقم چپ چاپ حرم کے اندر باہر صفائی کرنے والوں میں سے کسی کو دے دیجیے۔ یہ بہت معمولی تنخواہ پاتے ہیں اور ایسے ہی صدقات پر ان کا گزارا ہوتا ہے۔ پھر یہ جس محنت اور خلوص سے یہاں کے ایک ایک انچ کو صاف کر کے چمکائے رکھتے ہیں وہ صرف تنخواہ سے نہیں ہوتا۔ اس کے لیے اندرونی جذبہ چاہیے۔ ان کے اسی جذبے کی قدر کر کے ان کی مدد کرنی چاہیے۔''

دو ہی دن میں اس کی تصدیق ہوگئی۔ مولانا نشاط احمد قاسمی (مظفر پور) سے حرم میں ملاقات ہوگئی۔ عصر کے بعد سے عشا تک چھت پر ہم ایک ہی ساتھ بیٹھے رہے۔ باتوں باتوں میں وہ بتا گئے —— ''نیچے زمزم کا پانی بھر کر رکھنے والوں میں سے ایک سے بات ہو رہی تھی۔ میرٹھ کا ہے۔ بائیس سو پچاس ریال تنخواہ ہے۔ پانچ سو اس کو ملتے ہیں اور ساڑھے سترہ سو اس کا کفیل لے لیتا ہے۔''

اب اس ریکٹ کا کوئی کیا کرے۔ ویسے اکثر میں نے لوگوں کو ان ہرے اور نارنگی لباس والے کارکنوں کی مٹھی میں پیسے پکڑاتے دیکھا ہے۔ ان کی حالت لوگوں سے پوشیدہ نہیں ایک صاحب نے بتایا کہ باہر صفائی کرنے والوں کے ہاتھ میں صرف ڈھائی سو ریال ملتے ہیں۔ پھر بھی ہم میں سے بیشتر ان پر رشک کرتے رہے کہ انہیں حرم شریف کی خدمت کا شرف حاصل ہے اور وہ روزانہ کی نماز مسجد الحرام میں ہی پڑھتے ہیں۔ سبحان اللہ !

چمکتے چہرے

حرم شریف میں صفائی کا نظم بھی ایک مشاہدہ کرنے کی چیز ہے۔مطاف کبھی خالی نہیں ہوتا۔ چوبیس گھنٹے طواف جاری رہتا ہے۔سوا اس وقت کے جتنی دیر فرض نمازوں کی جماعت کھڑی رہتی ہے۔ایسے میں صفائی کے لیے کسی وقت کا تعین ممکن نہیں، یہ طواف کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور دن بھر میں کئی بار ہوتی ہے۔ پندرہ بیس کارکن چوڑی اور مضبوط سرخ پٹی کا ایک گھیرا بناتے ہیں اور اس گھیرے کے اندر دس بارہ لوگ برش، جھاڑو اور پانی کو جذب کرنے کے ساز و سامان کے ساتھ ہوتے ہیں۔ساتھ ہی ٹرالی پر فینائل، ڈیٹال، ڈیٹرجنٹ ملا ہوا پانی وغیرہ رہتا ہے۔پائپ سے پانی ڈالا جاتا ہے۔صفائی کا محلول ڈالا جاتا ہے۔پچیس تیس فٹ کے علاقے پر اسے پھیلا کر رگڑتے ہیں، پھر پانی ڈالتے ہیں، اسے سمیٹتے ہیں اور اس پورے عمل میں یہ قافلہ اسی سمت آگے بڑھتا جاتا ہے جدھر طواف کرنے والے بڑھتے ہیں۔انکے اردگرد سے طواف کرنے والے بھی گزرتے رہتے ہیں۔اسی طرح گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں انکا ایک چکر پورا ہوتا ہے۔

مسجد حرام میں بھی ایک منٹ کے لیے سناٹا نہیں ہوتا۔یہ صفائی والے اسی میں نمازوں کے درمیان لوگوں کو ہٹا کر فرش کو صاف کرتے جاتے ہیں۔اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے لوگ ایک ہی جگہ پر مستقل جم کر بیٹھ نہیں پاتے، ادھر ادھر ہوتے رہتے ہیں۔اسی میں ادھر ادھر ڈالی ہوئی چپلیں اور پڑا ہوا سامان بھی کچرے میں چلا جاتا ہے۔ ہر گھنٹے ہزاروں آدمی آتے جاتے ہیں۔صبح سے شام تک یہاں پہنچنے والی دھول کی مقدار کو ٹنوں میں ہوگی۔انہی کی مستعدی کی وجہ سے صبح سے شام تک اس احاطے میں گھومنے والوں کے تلوے بھی سیاہ نہیں ہوتے۔

چھت پر چونکہ ستونوں کی رکاوٹ نہیں ہے اس لیے صفائی کا یہ کام خودکار گاڑیاں انجام دیتی ہیں۔ یہ بیٹری سے چلنے والی بے آواز گاڑیاں ہیں۔ ان کے ڈرائیور ادھر ادھر پھیل کر بیٹھے یا لیٹے ہوئے لوگوں کو آواز دے دے کر ہٹاتے ہیں اور گول دائروں میں ان گاڑیوں کو چلاتے ہوئے صفائی کا سلسلہ یوں جاری رکھتے ہیں کہ چھت آئینہ کی طرح چمکتی ہے۔ خاصے لوگ زمزم کے نلوں کے پاس متعین ہیں تاکہ کمی ہونے پر فوراً وہاں تازہ ڈسپوزیبل گلاس مہیا کر سکیں اور وہاں گرنے والے پانی کی صفائی کر سکیں۔

ایک اچھی خاصی تعداد ان لوگوں کی ہے جو ہاتھ میں پولی تھین کے بہت بڑے بڑے تھیلے لیے حرم شریف میں آنے جانے کے راستوں میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھڑے رہتے ہیں۔ آنے جانے والوں کے ہاتھ میں کچرے کے ڈبے میں ڈالنے لائق کوئی چیز ہو تو یہ اپنا تھیلا آگے کر دیتے ہیں۔ پانی کی خالی بوتلیں، کولڈ ڈرنکس کے کین، پولی تھین کی تھیلیاں، کاغذی پیکٹ، ڈبّے وغیرہ جو بھی پھینکنے کی چیز ہو اس میں ڈال دیں۔ پھر ہر پچاس سو قدم پر ڈسٹ بن رکھے ہیں سو الگ۔ سچی بات یہ ہے کہ ہم جیسے لوگ جتنی سنجیدگی، مستقل مزاجی، محنت اور کوشش سے اس علاقے میں گندگی پھیلاتے ہیں اتنی ہی یکسوئی، دلچسپی، خاموشی اور انکساری کے ساتھ یہ اس کو صاف کر کے چمکانے میں لگے رہتے ہیں۔ اللہ آخرت میں انکے چہروں کو چاند کی طرح چمکائے رکھے۔ آمین!

مسجد عائشہ یاتنعیم

حج تمتع کے لیے ہم احرام باندھ کر آئے تھے اور عمرہ کر کے احرام اتار دیا تھا۔ پھر حج کے لیے احرام باندھا۔ اب جب سارے ارکان سے فارغ ہوئے اور بیت اللہ کے قریب آ گئے تو عمرہ کرنے کا پروگرام بننے لگا۔ اس میں بھی جتنے منہ اتنی باتیں ___ ظہر سے عصر کے بیچ میں کر لو سب سے آسان ہے۔ ___ عشاء کے بعد کرو، سکون کا وقت ہوتا ہے۔ ___ رات دو بجے جاؤ بالکل خالی ملے گا وغیرہ، وغیرہ۔

ہم نے سب پر غور کیا اور بالآخر احرام باندھ کر فجر کے وقت کمرے سے نکلے۔ فجر کی نماز حرم شریف میں پڑھی اور مسجد عائشہ جانے کے لیے سواری کی تلاش میں لگ گئے۔ میں نے ایک کار والے کو مخاطب کیا ___ ''مسجدِ عائشہ''۔ اس نے سر ہلایا اور بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تنعیم تنعیم'' مجھے یاد آیا کہ وہ جگہ تنعیم کہلاتی ہے۔ میں اطمینان سے بیٹھ گیا۔ میرے ساتھ دو لوگ اور تھے۔ بیٹھ تو وہ بھی گئے لیکن مجھے شبہ کی نظروں سے دیکھتے رہے۔ لوگوں نے بتایا تھا کہ ٹیکسی پانچ منٹ میں پہنچا دیگی۔ ہم نے اس بول چال کے پانچ منٹ کو سچ مچ کا پانچ منٹ سمجھ لیا تھا۔ جب دس منٹ ہو گئے تو بے چینی بڑھی۔ پھر بھی مجھے اطمینان تھا کیونکہ اور بھی گاڑیاں اسی طرف جارہی تھیں جن پر احرام پوش سوار تھے۔ آخر ایک جگہ حدود حرم کے خاتمے کا بورڈ نظر آیا اور کار رکی تو سامنے عظیم الشان چوکور سی مسجد دکھائی دی۔ کافی چہل پہل تھی۔ سیکڑوں لوگ احرام باندھ کر یا احرام ساتھ لے کر عمرہ کی نیت کرنے آئے تھے۔ ہم نے دو رکعت نماز پڑھی احرام کی نیت کی اور لبیک پڑھ کر واپسی کے لیے باہر نکلے۔

آتے وقت تو کچھ طے نہیں ہوا تھا۔اترنے کے بعد پوچھا تو اس نے تینوں کے سو ریال مانگے۔ہم لوگ جانتے تھے کہ لوگ پانچ پانچ ریال میں آ چکے ہیں اس لیے میں تین لوگوں کے لیے خمستشرہ یعنی پندرہ ریال دینے پر اڑا رہا۔تھوڑی سی زبانی جنگ کے بعد میں نے 50 ریال کا نوٹ پکڑایا اس نے پینتیس ریال واپس کیے۔میں نے کہا شکراً اس نے بھی جواب میں شکراً یا لطفاً جیسا کچھ کہا۔دونوں مسکرائے ہوئے اپنے اپنے راستے پر بڑھ گئے۔آتے وقت منیٰ بس نما گاڑیاں زیادہ تھیں وہ خمسہ ریال، خمسہ ریال کہ کر بلا رہے تھے۔جواباً ہم نے ثلاثہ ریال، ثلاثہ ریال کا نعرہ لگایا۔ایک گاڑی والے نے ہمیں بیٹھا لیا۔جب تھوڑا آگے بڑھے تو اس نے آہستہ سے اردو میں کہا کہ دو تر کی جو آگے بیٹھے ہیں انکو دو دو ریال طے کر کے بٹھایا ہے۔ہم نے کہا کوئی بات نہیں ہم تین ہی دیں گے۔

چھ بجے کے بعد ہم مسجد عائشہ روانہ ہوئے تھے۔واپس آکر ساڑھے سات کے آس پاس طواف شروع کیا، پھر سعی۔ساڑھے نو بجے تک فرصت۔پھر حلق کرا کے نہا لیا۔پھر بھی لوگ زیادہ عمرہ کر نہیں پائے۔اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔سب سے اہم ہے احرام کی پابندی۔حج کے وقت تو ایک مختلف ماحول ہوتا ہے سب کے سب اسی لباس میں ہوتے ہیں۔کچھ الگ سا محسوس نہیں ہوتا۔لیکن اکیلے احرام پہنتے ہی خصوصی ذمہ داری کا احساس ہونے لگتا ہے۔ہم سب نے کئی دن احرام میں گذارے تھے۔اس دوران نہ سر اور چہرہ چھپا سکتے تھے نہ پیر ڈھک سکتے تھے۔ایک مچھر یا مکھی نہیں مار سکتے تھے۔ایک پیڑ کی ڈالی توڑی تو دم واجب۔عطر لگا لیا یا انجانے میں لگ گیا تب بھی صدقہ واجب۔اب اتنی پابندی تین چار گھنٹے جھیلنی بھی مشکل تھی۔

ہمارا عمرہ کا طواف جاری تھا۔میرے آگے شیخ ایوب علی صاحب تھے۔وہ کولکاتا کے نواح میں کسی مسجد کے امام ہیں۔ہم دونوں ساتھ ساتھ مسجد عائشہ سے نیت کر کے چلے تھے۔تیسرا

چکر تھا۔ ساتھ ساتھ طواف کرتے ہوئے ایک شخص نے جیب سے عطر کی شیشی نکالی اور آس پاس کے لوگوں کو عطر پیش کرنا شروع کیا۔ ایوب صاحب کی ہتھیلی پر بھی ڈھیر سا عطر لگایا۔ انہوں نے درود پڑھتے ہوئے ہتھیلی پر لگے ہوئے عطر کو مل کر پورے بدن پر پھیلانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ میری نظر پڑ گئی۔ میں نے آواز لگائی تو وہ ہوش میں آئے۔ جس شخص نے عطر پیش کیا تھا وہ بھی خجل ہو گیا۔ ایوب صاحب جلدی جلدی اپنے ہاتھ کا عطر اسی شخص کے لباس پر پونچھنے لگے جس نے وہ عطر لگایا تھا۔ طواف کے بعد بھی دیر تک ہاتھ دھوتے رہے۔ دوپہر میں مفتی صاحب سے مسئلہ پوچھا۔ معلوم ہوا کہ صدقہ دینا پڑے گا۔ یہ سارے مسائل اپنی جگہ، پھر بھی جس کی جتنی ہمت تھی اتنا عمرہ اس نے کیا۔ ہمارے گروپ میں ایسے لوگ بھی تھے جو تقریباً روز ہی ایک عمرہ کر لیتے تھے۔ ہر روز طواف میں اچھی خاصی تعداد میں عمرہ کرنے والے احرام پوش بھی موجود رہتے تھے۔

مجھے کئی عمرے کرنے تھے۔ والد مرحوم کی طرف سے، والدہ کی طرف سے، اہلیہ مرحومہ کی طرف سے، حال ہی میں وفات پائے بہنوئی کی طرف سے اور بھی کئی رشتہ داروں کی طرف سے، لیکن میں نے سب سے پہلا عمرہ کیا پروفیسر مصطفیٰ سیماب کی طرف سے۔ انہوں نے پٹنہ میں ایک عمرے کا وعدہ لے لیا تھا۔ میں یہ عمرہ بعد میں بھی کر سکتا تھا لیکن ذہن میں ایک بات آ گئی کہ خدانخواستہ کسی وجہ سے اگر بعد میں نہ کر پایا تو وعدے کا کیا ہوگا؟

سگِ کوئے حرم

مکہ اوراس کے اطراف میں کبوتر بکثرت ہیں۔ گوریا بھی دکھائی دیتی ہے۔ مسجد حرام میں ابابیلیں بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ لیکن کوا ایک بھی دکھائی نہیں دیا۔ ہاں رات میں چمگادڑ ضرور دکھائی دیتے ہیں۔ اسی طرح کتے دکھائی نہیں دیتے ہاں، بلیاں کثرت سے نظر آتی ہیں۔ میرے سب سے نئے دوست نادر خاں سرگروہ کے مطابق دس بیس کلومیٹر باہر نکلنے پر نواحی آبادیوں میں کوے بھی دکھائی دیتے ہیں اور کتے بھی۔ کتوں کی تعداد گھٹانا یا ختم کر دینا زیادہ مشکل نہیں لیکن کوؤں کے آنے کو روکنا عملاً ناممکن ہے۔ یہاں گھر کے کوڑے کچرے (جن میں بچے ہوئے کھانے کی بھی خاصی مقدار ہوتی ہے) کو باہر کھلے میں پھینکنے کا رواج نہیں۔ سارا کچرا پولی تھین کے بیگوں میں بھر کر رکھا جاتا ہے جہاں سے کارپوریشن کی گاڑیاں لے جا کر اس کا ڈسپوزل کرتی ہیں۔ یہ عام دنوں میں کامیابی کے ساتھ ممکن ہے۔ لیکن جب شہر کی آبادی ہر روز لاکھ ڈیڑھ لاکھ بڑھنے لگے تو کھانے پینے کی چیزوں کا کھلے میں پڑے رہنا عام بات ہے۔ جب ہر گلی اور ہر موڑ پر روٹی، چاول، گوشت وغیرہ کے بچے کھچے ٹکڑے اور کبھی کبھی خاصی مقدار میں کھانے کا بچا ہوا سامان بکھرا ہو تو کوے کا دس بیس کلومیٹر کی مسافت طے کر کے چلے آنا کوئی خاص بات نہیں۔ لیکن ایسا ہوتا نہیں۔ اس کی وجہ مجھے کسی نے نہیں بتائی۔

اس دوران مجھے بار بار اشوک اگروال کا لکشیہ دیپ کے جزائر کا سفرنامہ' مونگے کے ٹاپو اور ساگر پُتر' یاد آ رہا تھا۔ ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے:

جیٹی کی اُور لوٹتے ہوئے وہ ادھوراپن جو یہاں آتے ہوئے محسوس ہورہا تھا —— ہرے بھرے

منورم ٹاپو میں کچھ چھوٹنے جیسا ـــــ اچانک تیزی کے ساتھ مجھے بیچین کرنے لگا. سورج ڈھل رہا ہے لیکن کہیں کوئی کلرو نہیں، کوئی کوّا تک نہیں۔

ورید عنسا ـــــ " کہا جا تا ہے کہ محی الدین پلّی کی مسجد میں بہت سال ہوئے کوئی سنت نماز پڑھ رہے تھے۔ آسمان میں اڑتے کوّے نے انکے اوپر بیٹ کر دی۔ سنت نے غصے سے گھورا اور کہا، 'جاؤ! اب یہاں کبھی دکھائی نہیں دینا.' اسی دن سے سارے کوّوں نے 'کاوارتی' چھوڑ دیا "ـــــ اس کا کوئی ویگیانک کارن سمجھ میں نہیں آیا، کیونکہ پاس کے کئی ٹاپوؤں میں خوب کوّے ہیں۔

ویسے حیرت کی بات ہے کہ میں نے ایک دن عصر کے وقت حرم کی طرف بڑھتے ہوئے ہوٹل کے سامنے دو بڑے بڑے صحتمند کتوں کو دیکھا۔ بعد میں ذکر کرنے پر معلوم ہوا کہ اور بھی کئی لوگوں نے دیکھا تھا۔ جانکار اور پرانے لوگوں کے مطابق انہوں نے مکہ میں کتا پہلی بار دیکھا، وہ بھی حرم کے آس پاس۔ میرا خیال تھا کہ کتے کسی ٹرک یا ایسی ہی کسی گاڑی پر چڑھ کر کہیں سے آ گئے ہوں گے۔ ویسے میرا یہ بھی خیال تھا کہ یہ زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکے ہوں گے، کیونکہ میں نے سامنے والے ہوٹل کے ایک باوردی اسٹاف کو ایک پیالے میں کچھ لیے ہوئے کتوں کو اپنی طرف بلاتے ہوئے دیکھا تھا، غالباً دودھ تھا جس کی طرف کتوں کی رغبت ہوتی۔ ذہن نے خود ہی فیصلہ کر لیا کہ ضرور دودھ میں زہر ملا کر دیا جا رہا ہوگا۔

اذان ہو چکی تھی اور تھوڑا سا وقت بھی اس لیے تھا کہ یہاں عصر میں فرض سے قبل سنت کا اہتمام کرتے ہیں۔ میں نے جاتے جاتے مڑ کر دیکھا تو لگا کہ دونوں کتوں نے اس پیالے سے کچھ نہ کچھ پیا ضرور تھا۔ ایسا نہیں لگا کہ کوئی اس جگہ پر کتوں کی ضیافت کرے گا میں نے مان لیا کہ یہ ضرور ان کا آخری کھانا پینا ہوگا۔ شاید یہاں کے لوگ ایسی صورتحال کے لیے ذہنی طور پر تیار رہتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میں نے انہی دونوں کتوں کو دوبارہ، سہ بارہ دیکھا اور یہ شک ہونے لگا کہ یہ کسی کے پالتو تو نہیں؟ کیونکہ کسی نے ان کا نوٹس نہیں لیا، وہ بھی مسجد حرام سے سو گز کی دوری پر!

صیادی چاول اور فارس مچھلی

نادر خاں سرگروہ کا ذکر آ گیا تو ان کے تعارف کے بغیر آگے بڑھنا مشکل ہے۔ پیشے سے انجینئر کونکن کے یہ نادر سپوت بڑے تکلف سے مسکراتے ہیں، بڑی سنجیدگی سے مزاح لکھتے ہیں، بڑی انکساری سے اپنی تحریریں پڑھواتے ہیں اور بڑے اصرار سے مہمان نوازی کرتے ہیں۔ ان سے ملنے کے بعد مجھے افسوس ہوا کہ میں پہلے سے ان سے واقف کیوں نہ تھا۔ یہ دلشاد نظمی کے پرانے شناسا ہیں انہوں نے ہی رانچی سے میرے بارے میں انہیں میل کر دیا اور میرا فون نمبر دے دیا۔ رابطہ کر کے ملنے آ گئے۔ اپنی کچھ تحریریں پڑھنے کو عنایت کیں اور ملنے آتے رہے۔ اپنی گاڑی پر مکہ کی ایک جھلک دکھائی۔ پہلی ہی ملاقات میں کھل گیا کہ ہم دونوں طنز ومزاح کے شیدائی ہیں سو زیادہ تر اسی موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔ مطالعہ اچھا اور پسند ناپسند تقریباً میرے جیسی ہے، یا کم از کم مہمان نوازی کی روایات کی پاسداری میں انہوں نے یہی ظاہر کیا۔

ایک دن مکہ سے طائف جانے والی شاہراہ پر اپنی پسند کے ایک ریسٹورنٹ میں لے گئے جو مچھلیوں کے لیے مشہور ہے۔ شوکیس میں الگ الگ رنگ، روپ اور وزن کی مچھلیاں برف میں رکھی تھیں۔ نادر صاحب نے مچھلیاں پسند کر کے وزن کرائیں اور ہم بیٹھ کر ان کے پکائے جانے کا انتظار کرنے لگے۔ یہ بیس پچیس منٹ میں تیار ہو جاتی ہیں۔ کم تیل مصالحہ والی یہ اوون میں سکی ہوئی مچھلی بہت لذیذ ہوتی ہے۔ یہاں یہ بغیر شوربے کی مچھلیاں سوکھے چاول کے ساتھ کھائی جاتی ہیں۔ ہاں، کھانے والے کی سہولت کے لیے ساتھ میں املی کا پانی اور سفید سی پھیکی چٹنی بھی مہیا کی جاتی ہے۔

چاول بھی نادر صاحب نے خصوصی طور پر آرڈر کیے تھے۔ایک ہی پلیٹ میں ایک طرف سفید سادے چاول دوسری طرف بالکل بھورے چاول ، جو صیادی کہلاتے ہیں۔ نادر صاحب نے وضاحت کی کہ صیاد عربی میں مچھوارے کے لیے مستعمل ہے(چڑی مار کے لیے نہیں)۔یعنی مچھلی کھایئے مچھوارے کی پسند کے چاول کے ساتھ،اس کو کہتے ہیں خوش ذوقی ۔ میں نے چاول کے ساتھ مچھلی بہت کھائی ہےلیکن مچھلی کے ساتھ چاول شاید پہلی بار کھائے۔ مجھے ایک خاصی بڑی 'فارس' مچھلی ،جس میں کانٹے برائے نام تھے،کھانی پڑی اور اوپر سے ڈھیر سارے بڑے بڑے جھینگے ، جو مجھے ویسے ہی بہت پسند ہیں۔ بالاخر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ چاول کی خاصی مقدار چھوڑ دینی پڑی پھر بھی مچھلی تھوڑی بہت بچ ہی گئی ۔

ایک دن ایک انڈونیشین ریسٹورنٹ میں لے گئے۔ وہاں ایک ڈش آرڈر کی جس کا نام تھا' مُشَکّل' (م کو پیش،ش کو زبر اور ک کو تشدید کے ساتھ زیر دے کر پڑھیے)۔اس کی تشکیل میں کئی چیزیں شامل تھیں۔ایک پلیٹ میں تھوڑے سادے چاول اوران کے چاروں طرف بڑے سلیقے سے دوطرح کی سبزی ، دوطرح کا گوشت،تھوڑا سا مرغ،ایک انڈے کا سالن،تھوڑے سے ایک خاص قسم کے چھوٹے چھوٹے پاپڑ وغیرہ۔ان کے درمیان سادے چاولوں کی حیثیت ایسی ہی لگ رہی تھی جیسی اکبر بادشاہ نورتنوں سے گھرا بیٹھا ہو۔

نادر خان سرگروہ کی تحریریں بھی اگر فارس مچھلی کی طرح اندر سے نرم اور اوپر سے کرکری ہیں تو 'مشکل' کی طرح رنگا رنگ ہیں۔ انشائیہ میں شروع سے اخیر تک readability قائم رکھتے ہیں اور بات سے بات پیدا کر کے شگفتہ مزاح کی پھلجھڑیاں چھوڑتے رہتے ہیں۔ان کی تحریروں کا مجموعہ'باادب'بامحاورہ،ہوشیار!' زیر ترتیب ہے۔

منھ میرا ہندوستان کی طرف؟

خانہ کعبہ کے کبوتروں کے بارے میں دو باتیں کہی جاتی ہیں۔ پہلی، یہ اسی کبوتر کی نسل سے ہیں جس نے ہجرت کے وقت غار ثور کے باہر انڈا دیا تھا، دوسری، یہ خانہ کعبہ کے اوپر سے کبھی پرواز نہیں کرتے۔ پہلی بات کے لیے کوئی ثبوت یا دلیل فراہم نہیں کی جا سکتی نہ کسی کو اس کے ماننے پر مجبور کیا جا سکتا ہے لیکن یہ ہزاروں کبوتر مسلسل ادھر ادھر اڑتے رہتے ہیں لیکن میں نے کبھی کسی کو خانہ کعبہ کی عمارت کے اوپر سے گذرتے نہیں دیکھا۔ یہاں تک کہ کوئی کبوتر اس کی منڈیر یا چھت پر بیٹھتا بھی نہیں۔ لوگ گیہوں چاول چنے وغیرہ خرید کر مسجد حرام کے باہر صحن اور سڑکوں پر ڈال دیتے ہیں جن کو جھنڈ کے جھنڈ کبوتر چگتے رہتے ہیں۔

مسفلہ میں تو ایک چوراہا کبوتر چوک کہلاتا ہے وہاں بھی بیچ سڑک پر کبوتروں کے جھنڈ دن بھر دکھائی دیتے ہیں۔ یہ جگہ اتنی مشہور ہے کہ لوگ پتہ بتاتے ہیں، ''کبوتر چوک سے بائیں جا کر سامنے'' یا ''کبوتر چوک سے دائیں، دو مکان کے بعد' یہاں عموماً سیاہ فام عورتیں پولی تھین کے پیکٹ میں میں گیہوں لیے دکھائی دیتی ہیں اور آواز لگاتی ہیں—— ''دوریال دوریال۔ دانہ لے لو۔ دوریال۔'' دلچسپ بات یہ ہے کہ بہت سے مرد اور عورتیں سڑک پر بیٹھ کر بکھرے ہوئے گیہوں کے دانوں کے درمیان کچھ چنتے دکھائی دیتے ہیں۔ کسی نے بتایا کہ یہ صحیح سلامت دانے چن کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور برکت کے لئے انہیں گملوں میں اگاتے ہیں۔ یہ بھی سنا کہ خانہ کعبہ کے مقیم کبوتروں کے جو ٹھے کئے ہوئے دانوں کو لوگ شفا کا باعث سمجھتے ہیں۔ یہاں سے چن کر یہ دانے لے جاتے ہیں اور کسی مرض میں بیمار کو کھلاتے ہیں۔

مسجد حرام کے پرانے حصے میں ابابیلوں کا بھی بسیرا ہے۔ان کے بارے میں بھی مشہور ہے کہ انکے جدامجد وہی ابابیل تھے جو ابرہہ کے لشکر پر اُمڈ کر آئے تھے اوراس کو بھوسہ کر دیا تھا۔ انکی حیثیت خانہ کعبہ کے محافظوں کی ہے۔میں نے سوچا کہ دل توڑنا بھی خانہ خدا ڈھانے جیسا ہے اگر اللہ ان کو حکم دے کہ ایک ایک کنکر ایسے لوگوں پر بھی ڈال دو تو کتنے لوگ زندہ بچیں گے؟

مسجد حرام کی چھت پر بیٹھے بیٹھے ایسی ایک سے بڑھ کر ایک باتیں ذہن میں آتی رہتی تھیں۔ایک روز ڈوبتے سورج کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ ہم لوگ ہندوستان سے کعبہ کی طرف رخ کرتے ہیں تو ہمارا چہرہ تقریباً مقام ابراہیم کے سامنے ہوتا ہوگا۔یہ بھی خیال آیا کہ اس وقت مغرب کی نماز میں میرا منھ ہندوستان کی طرف ہے۔اسی کے ساتھ یہ سوچ کر بھی مسکراہٹ آگئی کہ یہی ایک مسجد ہے جہاں امام اور مقتدی آمنے سامنے ہو سکتے ہیں۔بلکہ یہی ایک مسجد ہے جہاں صفیں سیدھی نہیں گول کی جاتی ہیں۔

خانۂ کعبہ کے مطاف اوراور چاروں طرف کی مسجد حرام میں ہی آپ کسی نماز پڑھتے ہوئے شخص کے سامنے سے بے تامل گزر سکتے ہیں۔شرعی اعتبار سے اس میں کوئی قباحت نہیں۔ زیادہ تر لوگ اس مسئلے سے واقف ہوتے ہیں لیکن میں نے ایک شخص کو اپنے سامنے سے گزرنے والے کو روکنے کے لیے نماز کے عالم میں بھی پوری کوشش کرتے ہوئے دیکھا ہے۔اس عالم اور متشرع نظر آنے والے شخص نے بغیر نیت توڑے دایاں ہاتھ آگے بڑھا کر گزرنے والے کو ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔جانے والے نے حیرت سے اس اشارے کو دیکھا اوراس کی پرواہ نہ کی۔ اس کے دوبارہ کوشش کرنے پر ہاتھ زیادہ جھٹکے سے آگے آیا۔تیسری بار تو ہاتھ کی مٹھی کسی ہوئی تھی اور بدن غصے سے تھرتھرا رہا تھا اور حلق سے غراہٹ کی طرح ہوں! ہوں! کی آواز آرہی تھی۔اسی عالم میں اس نے رکوع کیا لیکن جب وہ سجدے میں گیا تو جانے والا چلا ہی گیا۔

اپنی اپنی تیاری

خانہ کعبہ کے امام کا اپنے مصلّے پر آنا اور لوٹنا بھی دلچسپ عمل ہے لیکن بہت کم لوگ اس پر توجہ دے پاتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کو تو یہ معلوم ہی نہیں ہو پاتا کہ امام کہاں کھڑے ہو کر نماز پڑھاتے ہیں اور موذن یا مکبر کہاں ہوتے ہیں۔ میں نے بھی قسطوں میں اس کا مشاہدہ کیا۔ اگر آپ پہلی منزل پر یا چھت پر ہوں اور اذان کے پانچ سات منٹ پہلے سے متوجہ ہوں تو توپ اور چار کھانے کے رومال والا ایک کارکن کاندھے پر قالین نما جانماز رکھے طواف کرنے والوں کے بیچ سے راستہ بناتے ہوئے خانہ کعبہ کی طرف بڑھتا ہوا دکھائی دیگا اور پیچھے پیچھے ایک اور کارکن کاندھے پر مائک کا اسٹینڈ اٹھائے۔ جس وقت آپ دیکھ رہے ہوں گے کہ جائے نماز حطیم کے اندر بچھائی جا رہی ہے اس وقت رکن شامی اور رکن یمانی کی درمیانی دیوار کی سامنے مسجد حرام کی اس جگہ پر، جہاں ستونوں پر ایک شیشے کا کیبن بنا ہے اور وہاں جانے کی سیڑھیاں ہیں، دو تین وردی والے اور دو تین توپ پہنے کارکن موذن کو اپنے حلقے میں لیے پہنچتے ہیں۔

یہیں پر سامنے کا حصہ پروجکشن کے طور پر مطاف میں تھوڑا آگے بڑھایا ہوا ہے۔ اس طرح یہ حصہ مسجد کی حد سے باہر ہو گیا اور یہیں جنازے لاکر رکھے جاتے ہیں۔ چار پانچ وردی والے اور چار یا پانچ توپ اور رومال والے اہل کار اپنے گھیرے میں امام کو لیے خانہ کعبہ کی طرف بڑھتے ہیں۔ اس دوران وہاں موجود عملہ خانہ کعبہ کے گرد گھیرا ڈالے مجمع کو پیچھے ہٹا کر صف بندی کرتا ہے اور اسی بیچ دیوار کعبہ سے ملحق خالی جگہ کی صفائی کر دی جاتی ہے۔ جلدی جلدی خانہ کعبہ کی دیوار بھی پوچھی جاتی ہے۔ خانہ کعبہ کے دروازے کی چوکھٹ پر عطر ملا جاتا ہے جو بہترین قسم کا

ہوتا ہے کیونکہ اس کی خوشبو کافی دور تک محسوس ہوتی ہے۔ اسی بیچ امام جا کر حطیم میں بچھے مصلے پر بیٹھتے ہیں تب تک اذان شروع ہو جاتی ہے۔ کبھی تھوڑی تاخیر ہو جائے تو امام اذان کے درمیان بھی پہنچتے ہیں۔ اذان کے بعد امام وہیں پر سنت پڑھتے ہیں۔ موذن کے اقامت کہنے سے قبل امام اپنے مصلے سے اٹھ جاتے ہیں اور مصلے کو سمیٹ دیا جاتا ہے۔ امام خانہ کعبہ کے دروازے کے سامنے بچھے مصلے پر چلے جاتے ہیں اور وہیں سے نماز پڑھاتے ہیں۔

نماز کے بعد اگر جنازہ ہو (جو عموماً ہوتا ہی ہے) تو فرض پڑھانے کے بعد امام پھر اسی سکوریٹی کے حلقے میں وہاں پہنچتے ہیں جہاں جنازے رکھے جاتے ہیں۔ وہاں سے جنازے کی نماز ہوتی ہے۔ پھر امام و موذن اسی طرح اہل کاروں کے حلقے میں مسجد سے باہر لے جائے جاتے ہیں۔ اسی بیچ ایک کارکن جانماز کندھے پر رکھتا ہے اور دوسرا مائک کا اسٹینڈ سنبھالتا ہے۔ دونوں پہلے کی طرح انکو لیے واپس ہوتے ہیں۔ یہ سارا معاملہ ہر نماز کے وقت دہرایا جاتا ہے۔ عصر سے عشاء کے دوران چار گھنٹے میں کوئی چاہے تو تین بار یہ نظارہ کر سکتا ہے۔

جتنی دیر نماز ہوتی رہتی ہے چار پانچ وردی پوش سیکیوریٹی والے مستعد کھڑے رہتے ہیں۔ یہ نظارہ مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ ایسی بھی کیا ڈیوٹی کہ خانہ کعبہ کی دیوار سے دو ہاتھ کی دوری پر کھڑے ہیں اور نماز میں شامل نہیں ہو سکتے؟ لیکن جب نماز کے فوراً بعد کا منظر ایک بار غور سے دیکھا تو سب سمجھ گیا۔ دراصل جیسے مسجد الحرام کا عملہ نماز کے وقت سے پہلے اپنی تیاری شروع کرتا ہے ویسے ہی اور بھی لوگ بھی اپنی تیاری میں لگ جاتے ہیں۔ بہت سے لوگ طواف کے بغیر بھی نماز کے وقت بھیڑ میں جگہ بناتے ہوئے خانہ کعبہ کی دیوار تک آجاتے ہیں جب دیوار کے پاس سے لوگوں کو پیچھے ہٹا کر صف بندی کی جاتی ہے تو یہ، جو گھنٹے بھر سے تاک میں لگے رہتے ہیں، کوشش کر کے پہلی دوسری صف میں اپنی جگہ بنا لیتے ہیں۔

ایامِ حج میں تقریباً ہر نماز کے وقت ایسا ہوتا ہے کہ اس کارکن نے ایک طرف سے پیٹھ پھیری اور دوسری طرف بڑھا اسی دوران دو تین صف پیچھے سے کسی (مرد یا عورت) نے صفوں کے بیچ سے راستہ بنایا اور تیزی سے حجرِ اسود تک پہنچنے میں کامیابی حاصل کی۔ جب تک وہ کارکن پلٹے اور اسے روکے تب تک وہ حجرِ اسود کا بوسہ لے کر پھر سے صفوں کو پھلانگ کر پیچھے غائب۔ اس دس پندرہ سیکنڈ کے واقعے کے بعد جتنی خوشی اس کامیاب شخص کو ہوتی ہے اتنی ہی وہاں موجود لوگوں کو بھی ہوتی ہے۔ انتہائی سنجیدگی اور تقدس سے بھرے ماحول میں بھی اچانک اک پھلجھڑی سی چھوٹتی ہے۔ کبھی کبھی جب تک ایک کی طرف توجہ جائے اور اسے روکنے کی کوشش ہو تب تک پیچھے سے دو چار گھس کر اپنی من چاہی مراد پا لیتے ہیں اور چاروں طرف سے تاک میں لگے لوگ رشک سے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

رکن یمانی سے حجرِ اسود اور مقامِ ابراہیم کے سامنے کی دو تین صفوں میں پیچھے کی صفوں کی بہ نسبت لوگ ایک دوسرے سے گتھے ہوئے ہوتے ہیں۔ دونوں پاؤں سٹے ہوئے، کندھے سکڑے ہوئے، آڑے ٹیڑھے ایک دوسرے سہارے پر کھڑے یہ لوگ (جہاں تک میرا خیال ہے) نماز پڑھنے کے اتنے مشتاق نہیں ہوتے جتنے نماز ختم ہونے کے منتظر ہوتے ہیں۔ امام کے سلام پھیرتے پھیرتے یہ پوری صف اپنی جگہ سے جست کرتی ہے اور اپنے سامنے کی دیوارِ کعبہ سے چپک جاتی ہے۔ سب سے زیادہ دباؤ حجرِ اسود پر ہوتا ہے۔ کم سے کم دو سو لوگ تو ضرور اس کو دو منٹ میں چوم لیتے ہیں اسی طرح ملتزم اور درِ کعبہ پر لوگوں کا ایک ریلا امنڈتا ہے۔ اس وقت اگر وہاں موجود مستعد جوان امام کے چاروں طرف حصار نہ بنالیں تو ہر نماز کے بعد نیا امام تلاش کرنے کی نوبت آجائے۔

کھو کھلے جذبے

ہم 9 نومبر کو کولکاتا سے روانہ ہوئے تھے۔ نومبر کیسے بیتا پتہ ہی نہیں چلا۔ اب پندرہ دن میں واپس کولکاتا۔ پہلی دسمبر کی صبح فجر کے وقت تھوڑی سی خنکی تھی۔ شاید ہوا چلنے کا کچھ اثر رہا ہو۔ دھوپ ہوتے ہی موسم گرم ہوگیا۔ ناشتے پر معلوم ہوا یہاں ابھی درجہ حرارت کم از کم 23 اور زیادہ سے زیادہ 37 ڈگری ہے۔ جبکہ مدینہ منورہ میں یہ بالترتیب 14 اور 28 ہے۔ یقیناً وہاں کا موسم خوشگوار ہوگا، بلکہ یہاں کے حساب سے کہیں تو سرد ہی ہوگا۔ آج ناشتہ تھوڑا جلد ہوگیا تھا۔ کیونکہ آٹھ بجے چند اہم مقامات کی زیارت کے لیے روانہ ہونا تھا۔

سب سے پہلے جبلِ ثور جہاں غارِ ثور ہے۔ یہ پہاڑی میری توقع سے زیادہ بلند ہے۔ اپنے ہوٹل سے یہاں پہنچنے میں بمشکل آدھا گھنٹہ لگا لیکن آج سے چودہ سو سال قبل جب یہاں زمین ایسی مسطح نہیں تھی، حدِ نگاہ تک صرف ریت کے ٹیلے اور ناہموار پہاڑی سلسلے تھے تب مکہ سے نکل کر یہاں پہنچنا اور تقریباً ایک کلومیٹر کی چڑھائی چڑھ کر اس غار میں تین دن تک رُکے رہنا دشوار گذار مرحلہ رہا ہوگا۔ ہم دو بسوں میں بھر کر اس پہاڑی کے دامن تک پہنچے۔ بہت سے لوگ اس پر چڑھ رہے تھے۔ پہاڑ کی چوٹی تک لوگوں کا ایک سلسلہ تھا۔ اوپر چڑھتے ہوئے لوگ بتدریج چھوٹے ہوتے چلے جا رہے تھے۔ پہاڑی کی چوٹی پر صرف اندازے سے اور ہلتے ڈلتے رنگوں کے ہیولوں کی وجہ سے ہی یہ لگتا تھا کہ وہاں بھی لوگوں کی قطار ہے جو غار کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ہم نے یہ اندازہ لگایا کہ کم از کم دو گھنٹے کی چڑھائی چڑھ کر ہی وہاں پہنچا جا سکتا ہے۔ یہاں بس سے اترتے وقت پندرہ منٹ کا وقت دیا گیا تھا۔ حسرت سے اوپر چڑھتے لوگوں کو دیکھا اور

اس کھوجی کی مہارت پر حیرت کرتے ہوئے واپس ہوئے جس نے ہجرت کے وقت ریت اور پتھر پر قدموں کے نشانات تلاش کر کے کفار مکہ کو لے جا کر اس غار کے دہانے پر کھڑا کر دیا تھا۔

اگلا پڑاؤ تھا، عرفات کا میدان۔ ہم یہاں ایک دن گذار چکے تھے لیکن آج اس جگہ کو پہچاننا مشکل تھا۔ اللہ رے سناٹا، اللہ رے تنہائی! دور دور تک نہ آدم نہ آدم زاد۔ مسجد نمرہ مقفل، تمام سڑکیں ویران، عرفات اسٹیشن خالی۔ رِنگ روڈ پر ایک بھی سواری نہیں۔ بس جبل رحمت پر جا کر رکی۔ وہاں دس بارہ بسیں پہلے سے رکی ہوئی تھیں۔ پانچ چھ سو آدمی ادھر ادھر پھیلے ہوئے تھے۔ آدھے پہاڑی پر چڑھے تھے، آدھے ادھر ادھر سے گھوم گھوم کر دیکھ رہے تھے۔ یہاں پندرہ منٹ کا ٹائم دیا گیا تھا۔ چڑھائی مشکل نہیں تھی ایک طرف سے تو سیڑھیاں سی بھی بنی تھیں۔ میں تھوڑی دور تک چڑھ کر اتر آیا۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں سے آپ ﷺ نے وہ تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا جس کی نظیر دینے سے دنیا قاصر ہے۔ کاش یہاں اس خطبہ کا متن دنیا کی مختلف اہم زبانوں میں آویزاں کیا جاتا تو اس جگہ کی اہمیت لوگوں پر واضح ہوتی اور یہاں کا پیغام وہ اپنے ذہنوں میں اپنے ساتھ لے جاتے۔

یہاں پر ایک سایہ دار اسٹال بنا کر کچھ متشرع حضرات لاؤڈ اسپیکر سے مسلسل یہ نصیحت کر رہے تھے کہ کوئی یہاں کوئی نفل نمازیں نہ پڑھے کیونکہ اس سلسلے میں کوئی حکم نہیں۔ اتنی دور سے، اتنی محنت سے اور اتنا خرچ کر کے آئے ہوئے لوگ ان کی باتوں پر اس لیے بھی توجہ نہیں دے رہے تھے کہ ان کے چکر میں یہاں کی دو رکعت نماز بھی جائے گی۔ یہ نصیحت خاص طور پر اردو اور بنگلہ میں ہو رہی تھی۔ ان کے سامنے یہاں آنے والے سیاحوں کی سہولت کے لیے ایک بورڈ لگا تھا جس پر عربی میں جبل الرحمہ اور چھ زبانوں میں اس کا ترجمہ لکھا ہوا تھا۔ اردو میں لکھا تھا ـــ 'رحمت کا پحاڑ'۔ اتنے سارے اردو دانوں کو یہ 'پہاڑ' جیسی غلطی دکھائی نہیں دیتی؟

مزدلفہ، جمرۃ، منیٰ سب جگہ وہی ہو کا عالم۔ جہاں بغیر دھکا کھائے گذرنا ممکن نہیں تھا وہیں تاحدِ نگاہ ایک شخص نہیں تھا۔ خیمے کھل رہے تھے۔ بہت سارے خیمے تو کھول کر ہٹائے بھی جا چکے تھے صرف وہ بیت الخلا موجود تھے جن کے باہر لائن لگائے بچے، بوڑھے اور جوان گھنٹوں کھڑے رہتے تھے۔ان کے بھی دروازے، پانی کے پائپ وغیرہ کھول کر ہٹائے جا چکے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد تو صرف یہی ڈھانچے میدان میں کھڑے دکھائی دیں گے۔ اس وقت وہ تمام راستے ہاتھ کی لکیروں کی طرح واضح تھے جن کو پہچاننے میں روٹھی قسمت کو منانے سے زیادہ محنت کرنی پڑتی تھی۔

واپسی میں ہم جبلِ نور کے پاس رکے جس میں غار حرا واقع ہے۔ غار حرا بھی خاصی بلندی پر ہے۔ یہاں آپ ﷺ کئی کئی دنوں تک یادِ الٰہی میں محو رہتے تھے اور جہاں پہلی وحی نازل ہوئی۔ یہ جگہ آج ہم جیسے تن آسانوں کو اتنی دشوار گذار لگتی ہے کہ اوپر چڑھنے کے ذکر سے ہی سانس پھولنے لگتی ہے۔ وقت کی کمی کا بہانہ بنا کر اور یہ کہہ کر کہ —— ''پھر کبھی اللہ نے بلایا اور وقت رہا تو ہم ضرور اوپر تک جائیں اور وہاں دو رکعت نفل پڑھیں گے'' —— ہم بسوں میں بیٹھ کر ہوٹل لوٹ رہے تھے۔اور پہاڑی پر چیونٹیوں کی طرح دکھائی دے رہے انسانوں کی ایک قطار اوپر چڑھتی ہوئی ہمارے کھوکھلے جذبے کا مذاق اڑا رہی تھی۔

گو پائوں کو جنبش نہیں...

ماں باپ کی خدمت اور بیمار کی عیادت سے لے کر روزہ نماز تک اسلام میں عبادت کی جتنی شکلیں ہیں ان میں صرف ایک عبادت ایسی ہے جو صرف مکہ میں اور وہ بھی بیت اللہ کے ارد گرد ہو سکتی ہے، یعنی طواف ۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں طواف کو اہمیت اور اولیت دی جاتی ہے۔ طواف چوبیس گھنٹے میں صرف فرض نمازوں کی دو، تین یا چار رکعت کے دوران رکتا ہے۔ امام کے سلام پھیرتے ہی طواف کرنے والے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ آپ کو سنتیں پڑھنی ہوں یا جنازہ کی نماز، آپ کو یہ جگہ جلد از جلد خالی کرنی ہوگی۔ میں نے تو ایک دن مسجد حرام کی چھت پر نماز پڑھتے ہوئے ایک شخص کو مغرب کی فرض نماز کی تینوں رکعتوں میں صفوں کے درمیان طواف کرتے ہوئے دیکھا۔ حالانکہ (اللہ معاف کرے) میں بھی نماز کی حالت میں تھا لیکن میں کیا اور میری نماز کیا، چھت پر ریلنگ کے بالکل پاس تھا اور نہ چاہتے ہوئے بھی نظر اٹھ ہی جاتی تھی۔

دراصل خانہ کعبہ کے ارد گرد کی زبردست ہلچل اذان سے اقامت کے وقفے میں جس طرح ایک ٹھہراؤ اور سکون کی کیفیت میں بدلتی ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ ایسے میں جب لاکھوں آدمی بالکل ساکت ہوں ایک چھوٹی سی حرکت بھی توجہ کھینچ لیتی ہے۔ میں نے اس احرام پوش کو تینوں رکعت کے دوران نماز پڑھتے لوگوں کے سامنے سے گذرتے دیکھا۔ لوگوں کے رکوع اور سجود کے دوران وہ کیسے اپنے چلنے یا کھڑے ہونے کی جگہ بنا پاتا تھا یہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں یہ ضرور سوچتا رہا کہ اس کی فرض نماز تو قضا ہوگئی وہ بھی حرم کی، لیکن وہ یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اتنی دیر تک وہ ایک مخصوص عبادت کرنے والا دنیا میں اکیلا شخص تھا۔

ایسا مانا جاتا ہے کہ اجنّا بھی کعبہ کا طواف کرتے ہیں۔ کبھی کبھی تو کبوتروں کے جھنڈ بھی اس کے گرد اس طرح چکر کاٹ کراڑ جاتے ہیں کہ لگتا ہے طواف کا ایک شوط پورا کرلیا ہے۔ ایک بڑے ہی ثقہ اور معتبر شخص کے منھ سے میں نے سنا ہے کہ ــــ ''کبھی کبھی یوں محسوس ہوگا گویا ہوا کا ایک جھونکا آیا اور کعبہ کے گرد ایک گردش کر کے گزر گیا۔''

حاجی کا جمال اور جلال سب طواف ہی میں دکھائی دیتا ہے۔ اس کی اکڑ بھی اور انکساری بھی۔ سامنے کوئی رکوع میں ہے کوئی سجدہ میں جا رہا ہے، لیکن اس کے قدموں میں جنبش نہیں ہوگی۔ وہ اس کے دائیں بائیں آگے پیچھے سے یوں گزر جائے گا گویا اسکو کسی کی کوئی خبر ہی نہیں یا ایسے گذرنا اس کا خصوصی حق ہے۔ دوسری طرف ساتھ ساتھ طواف کرنے والے ایک دوسرے کی جتنی تکریم کرتے ہیں وہ بھی دیکھنے کی چیز ہے۔

مطاف میں تو لوگ جلد سے جلد سنت پڑھ کر جگہ خالی کر دیتے ہیں وہ بھی پیچھے کی صفوں والے، آگے والے نہ تو سنت کی نیت باندھتے ہیں نہ فرض کے بعد وظائف پڑھ پاتے ہیں۔ وہاں موجود شرطہ یا مطوّی بھی طواف طواف کہتا ہوا طواف نہ کرنے والوں کو جلد از جلد وہ جگہ خالی کرنے کو کہتا جاتا ہے۔ عموماً اگلی آٹھ دس صفوں سے طواف شروع ہوتا ہے اور دیکھتے دیکھتے یہ گھیرا بڑا ہوتا جاتا ہے، بڑھتا جاتا ہے۔ پھر اگلی نماز کا وقت ہونے تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ پھر صفیں بنی شروع ہو جاتی ہیں اور طواف کرنے والوں کی تعداد گھٹتے گھٹتے صفر ہو جاتی ہے۔ پھر وہی سلسلہ دہرایا جاتا ہے۔ چھت سے اس سمٹتے پھیلتے دائرے کو دیکھنا ایک عجیب منظر ہے جس کا اندازہ خود طواف کرنے والے بھی نہیں کر سکتے ــــ منجمد صفوں کا ایک متحرک و پر جوش سیال صفت دائرے میں تحلیل ہونا، پھر اس دائرے کی توسیع ہوتے ہوتے ایک ایسے گرداب کی تشکیل ہو جانا جس کے آگے کوئی رکاوٹ ٹھہر نہیں پائے ــــ یہ ایک ایسا نظارہ ہے جو پوری

دنیا میں صرف یہیں دیکھا جاسکتا ہے۔ پھر اذان کا وقت کے قریب آتے آتے اس سیلاب پر آگے اور پیچھے سے بند باندھا جاتا ہے۔ دیوار کعبہ کے پاس سے اور مطاف کے پچھلے سرے سے صف بندی شروع ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ اقامت پوری ہونے اور امام کے تحریمہ باندھنے تک یہ گرم خیز سیال پھر صفوں کے سانچے میں ڈھل کر سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہو جاتا ہے۔ گھڑی کی سوئیوں کی الٹی طرف گھومنے والا یہ گرداب جتنی دیر جاری رہتا ہے وقت گویا تھما سا رہتا ہے۔

کوئی چاہے خود اپنے آپ سے پوچھے یا کسی دوسرے طواف کرنے والے سے بات کر کے دیکھے، ایک بات ضرور ابھر کر سامنے آئے گی ـــــ کوئی دو طواف ایک جیسا نہیں ہوتا!

جیسے کل یوم ھو فی شان اللہ کی صفت ہے ویسے ہی بیت اللہ بھی روزنئی کیفیت کا مظہر ہوتا ہے۔ کسی طواف میں سکون ہے، کسی میں اضطراب ہے۔ کسی میں سب سدھے ہوئے ہولے ہولے گھوم رہے ہیں، کسی میں ہیجان ہے۔ کسی میں گریہ وزاری ہے، کسی میں سرشاری ہے۔ کسی طواف میں سب زیرلب دعا کناں، کسی میں سب مصروف آہ وفغاں۔ رفتار سے لے کر اطوار تک اور افکار سے لے کر اذکار تک، ہر طواف کی الگ شان ہے بلکہ کبھی کبھی تو شروع کے تین چار چکر کی کیفیت دوسری ہوتی ہے اور بعد کے تین چار چکر کی بالکل دوسری۔ اگر کوئی دور سے خصوصاً اوپر کی منزلوں سے طواف کا بغور مشاہدہ کر رہا ہو تو وہ بھی اس کیفیت سے اچھوتا نہیں رہ سکتا۔

طواف میں عورتیں بھی برابری سے شریک ہوتی ہیں۔ نماز کے وقت بھلے ہی انہیں صفوں سے ہٹایا جائے یا پیچھے بھگا دیا جائے طواف کی حالت میں کسی کی مجال نہیں کہ کسی عورت کو روک دے۔ سیاہ فام عورتیں عموماً گروپ میں اور کبھی کبھی اکیلی بھی طواف کرتی دکھائی دیں گی۔ ان کے ساتھ مرد بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔ انڈونیشیا، ملیشیا، ترکی، ایران وغیرہ کی عورتیں عموماً گروپ میں ہی ہوتی ہیں لیکن ان کے ساتھ مرد بھی ہوتے ہیں۔

ایشیائی ممالک کی عورتیں عموماً اپنے محرم کے ساتھ ہوتی ہیں۔ چاہے ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش کی ہوں یا چین کی یا عربی بولنے والے ممالک کی۔ زیادہ تر حالتوں میں مرد بھیڑ میں راستہ بناتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور اس کے کرتے کا دامن یا احرام کا کونا پکڑے اس کی بیوی اس کے نقشِ قدم پر چلنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔ کبھی کبھی یہ ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے قریب رہ کر طواف کرتے ہیں۔ اس میں اکثر دشواری بھی پیش آتی ہے۔ کبھی کوئی پیچھے والا گروپ تیزی دکھاتے ہوتے بیچ سے نکلنا چاہتا ہے اور کبھی کوئی آگے والا دھیما پڑ جاتا ہے۔ دونوں حالتوں میں سارا زور ہاتھوں پر ہوتا ہے اور اکثر پکڑ ڈھیلی ہو جاتی ہے۔ اگر بھیڑ کا دباؤ بنا رہے تو بہت دیر تک دونوں ایک دوسرے کے آس پاس پہنچنے کی کوشش ہی کرتے رہ جاتے ہیں۔

نوجوان جوڑا ہو تو عموماً اہلیہ آگے رہتی ہے اور شوہر اسے دونوں ہاتھوں کے حصار میں لیے طواف کے مرحلے سے گذرتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی یہ منظر بھی دکھائی دے گا کہ شوہر بے تعلقی سے آگے بڑھ رہا ہے، تھوڑی دور آگے جا کر پلٹتا ہے، پیچھے چھوٹ گئی عورت کو غصہ بھری نظر سے دیکھتا ہے، عورت آنکھوں آنکھوں میں بھیڑ کی شکایت اور اپنی بے بسی کی وضاحت کرتی ہے۔ دونوں پھر ایک دوسرے کے نزدیک آتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی ایسا جوڑا بھی دکھائی دے جاتا ہے جس کے بارے میں کسی کی رائے تھی کہ ـــــ ''انہوں نے سارے کنکر جمراۃ میں نہ مار لیے ہوتے تو یہیں ایک دوسرے کو مارتے۔''

ایک اچھی بات یہ ہے ضعیفوں اور معذوروں کی وھیل چیئر کے لیے پہلی منزل پر طواف کا نظم ہے۔ ان کے لیے الگ لین یا گلیارا ہے جس میں لوگ یا تو خود ہی اپنے والدین یا رشتہ داروں کو وھیل چیئر پر بٹھا کر طواف کراتے ہیں یا اس کے لیے کسی کی گرانقدر خدمات حاصل کی

جاتی ہیں۔حرم کے اندر ہی وھیل چیئر مہیا کرانے والا دفتر ہے۔یہاں اپنے کاغذات جمع کرایئے اور وھیل چیئر لے جایئے۔اگر یہاں لائن لمبی ہوتو باہر کوشش کیجیے۔کئی لوگ مل جائیں گے۔ معاوضہ طے کر لیجیے۔ ہاتھ کے ہاتھ طواف کرا دیں گے۔بیٹری سے چلنے والی خودکار کرسیاں بھی دستیاب ہیں جن کے لیے کسی معاون کی ضرورت نہیں۔ہاتھ کے پاس بٹن لگے ہیں۔دائیں بائیں یا آگے پیچھے کیجیے یا رفتار کم بیش کیجیے۔یہ کرسیاں طواف اور سعی دونوں میں استعمال ہوتی ہیں۔جنہیں مستقل طور پر وھیل چیئر کی ضرورت ہوتی ہے وہ تو اپنی کرسی کے ساتھ ہی آتے ہیں۔

میں پہلی منزل پر مصروف طواف تھا۔ایک وجیہ شخص کو وھیل چیئر پر بٹھائے ایک نوجوان لین کی طرف بڑھ رہا تھا۔وھیل چیئر کو تھوڑی دور چڑھائی کا سامنا تھا۔مقامی نوجوان اپنی طاقت، مہارت اور تجربے سے باسانی آگے بڑھ رہا تھا لیکن سوار نے بھی ایک ہاتھ سے ریلنگ کو تھام لیا اور اپنی طرف سے بھی زور لگانے لگے۔میرے ذہن میں ایک مصرعہ تھوڑی تحریف کے ساتھ کلبلایا:

گو پاؤں کو جنبش نہیں ہاتھوں میں تو دم ہے

میوزیم

جب گھر سے سینتیس دن کے سفر پر نکلے تھے تو لگتا تھا کہ یہ اتنی لمبی مدت کیسے بیتے گی۔ حج کے تو صرف پانچ دن ہیں اور مدینہ میں آٹھ دن کا قیام، تا کہ وہاں چالیس وقت کی نماز پڑھی جا سکے۔ آگے پیچھے ملا کر ایک ہفتہ اور جوڑ لیں تو بیس دن کافی تھے۔ لیکن 5 دسمبر کو اتوار کے دن احساس ہوا کہ ستائیس دن تو گذر چکے ہیں صرف دس دن باقی بچے ہیں اور کل مدینہ منورہ کے لیے روانگی ہے۔ لگا کہ ابھی پانچ سات دن اور یہاں رہنا چاہیے تھا ابھی تو مسجد الحرام کو بھی ٹھیک سے نہیں دیکھا، ابھی تک حطیم میں دو رکعت نماز پڑھنے کا موقع نصیب نہیں ہوا، ابھی تک بھیڑ اتنی کم نہیں ہوئی کہ ملتزم سے چمٹ سکیں، ابھی تک حجر اسود کو چھونے کی سعادت حاصل نہیں ہو سکی، ابھی تک ہم ہر روز بھیڑ کے گھٹنے اور طواف کرنے والوں کی تعداد کم ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔

ہر روز تقریباً ایک لاکھ لوگ اپنے اپنے وطن لوٹ رہے ہیں پھر بھی مطاف کی رونق حسب سابق ہے۔ تعداد کی کمی کا اثر دو ہی جگہ دکھائی دیتا تھا۔ مسجد کے باہر صحن میں، جہاں نماز کے اوقات میں اس کے باہر سڑکوں پر بھی دور تک صف لگتی تھی اور مسجد کی چھت پر، جہاں تعداد گھٹ کر دس ہزار سے کم رہ گئی تھی۔ چھت پر طواف میں یا فجر اور عصر کے وقت دو چار ہزار ہی دکھائی دیتے تھے۔ پہلی منزل پر بھی آسانی سے جگہ مل رہی تھی۔ پہلے نماز کے وقت سے گھنٹہ آدھا گھنٹہ پہلے آنا پڑتا تھا۔ اب اذان ہوتے ہوتے بھی آ گئے تو جگہ مل جاتی تھی۔ لیکن مطاف میں زیادہ فرق نہیں پڑا تھا کیونکہ دور دراز میں مقیم حجاج بھی روانگی سے قبل طوافِ وداع کے لیے ضرور آتے ہیں۔

میں نے عمرہ کے لیے مسجد عائشہ آتے جاتے مکہ میوزیم کا بورڈ دیکھا تھا لیکن رکنے کا موقع نہیں ہوتا تھا۔ ادھر نادر صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ جب وہ صحتیاب ہو گئے تو میں نے ذکر کیا۔ ان کا جواب تھا— ''سترہ برسوں میں مجھے آپ پہلے آدمی ملے ہیں جس نے میوزیم دیکھنے کی خواہش کی ہے۔'' پھر بتایا— ''اس میوزیم میں کچھ عرصہ قبل آگ لگ گئی تھی اور ابھی وہ غالباً پھر سے کھولا نہیں گیا ہے۔ میں آپ کو حرم شریف کے میوزیم لے چلتا ہوں۔''

یہ میوزیم اس کارخانے کے پہلو میں ہے جہاں خانہ کعبہ کا غلاف تیار ہوتا ہے۔ میوزیم زیادہ بڑا نہیں یا ابھی سارا سامان قاعدے سے display نہیں کیا گیا لیکن شروعات اچھی ہے۔ حرم کی پرانی تصاویر، حرم کی پرانی تعمیرات کے ماڈل، تعمیرِ ثانی یا توسیع کے دوران وہاں سے ہٹائے گئے سنگی طغرے اور کتبے، مقام ابراہیم کے اوپر کا پرانا قبہ، حجر اسود کے اوپر کا پرانا خول، وہ پرانا چوبی منبر جس کے نیچے چکے لگے ہوئے ہیں اور جو دھکیل کر خطبہ کی جگہ پر لایا جاتا رہا ہوگا، حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کے تعمیر کردہ خانہ کعبہ سے نکلا چوبی ستون، زمزم کے کنویں کے اوپر کی جالی اور گھرنی، زمزم پلانے کے پرانے برتن اور ایسی ہی بہت سی چیزیں یہاں محفوظ ہیں۔ خدا کا شکر ہے انہیں آثار قدیمہ کو محفوظ رکھنے کی اہمیت سمجھ میں آنے لگی ہے۔ یہاں بہت بھیڑ نہیں رہتی لیکن یہ دیکھ کر اچھا لگا کہ کچھ ہندوستانی اور کچھ پاکستان حجاج کا ایک گروپ ہمارے پہنچنے پر اس سے باہر آرہا تھا، ہمارے ساتھ بھی کئی ہندوستانی اندر داخل ہوئے اور ہمارے نکلتے نکلتے ایک بس انڈونیشیا کے حجاج سے بھری وہاں آکر رکی۔

6 دسمبر

یہ عجیب اتفاق تھا کہ میں اور میرے ساتھ ہزاروں حاجی آج کے دن اس گھر کے گرد طواف وداع کر رہے ہیں جس کو ڈھانے کی نیت رکھنے والا خاک میں مل گیا۔ اس وقت تو اللہ کا نام لینے والے گنتی کے تھے اور اللہ نے ابابیلوں سے یہ کام لے لیا۔ ہم کروڑوں کی تعداد میں تھے پھر بھی ابابیلوں کا انتظار کرتے رہ گئے اور آج بھی کر رہے ہیں۔ آج ہی طواف وداع کے بعد ہمیں اس نبی آخرالزماں کے شہر کے لیے روانہ ہونا تھا جن کی پیدائش اسی عام الفیل میں ہوئی تھی اور جن کو اپنے قریب ترین رشتہ داروں کی مخالفت بھی جھیلنی پڑی تھی۔ لیکن جب وہ 63 سال کی عمر میں حجۃ الوداع کا خطبہ دے رہے تھے تو خدا کے گھر پر نثار ہونے کا جذبہ رکھنے والے ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کرام ان کے سامنے موجود تھے۔

ہمیں چونکہ عصر کے وقت تک مکہ معظمہ چھوڑنا تھا اس لیے طے ہوا کہ سب اس سے قبل طواف وداع سے فارغ ہو جائیں۔ طواف وداع حج میں واجب ہے اور اس کے ترک کرنے پر بھی دم دینا پڑے گا۔ یہ تو مسئلہ کی بات ہوئی لیکن یہاں تو صورت حال یہ تھی لوگ جانے سے قبل زیادہ سے زیادہ طواف کر لینا چاہتے تھے۔ کچھ نے تو طواف وداع کرنے کے بعد بھی طواف کیا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ کوئی حرج نہیں جو آخری طواف کیا اسی کو طواف وداع مانا جائے گا۔

ہم جیسے کچھ لوگوں کا ذہن بنا کہ ظہر سے اتنا پہلے جائیں کہ طواف وداع کر لیں اور ظہر پڑھ کر حرم سے واپس آجائیں۔ سر پر کڑی دھوپ تھی لیکن ایک چکر کے بعد دھوپ بھی ہلکی لگنے لگی چکر بھی تیزی سے ہوئے۔ دھیرے دھیرے خانہ کعبہ سے فاصلہ بھی گھٹا، گویا آخری طواف کافی

حد تک میرے پہلے طواف جیسا ہی ہوا۔ مقام ابراہیم کے آس پاس سے گذرتا رہا۔ خانہ کعبہ کی دیواریں دسترس میں تھیں۔ حجر اسود کے بھی کافی قریب سے گزرا۔ کئی بار خواہش ہوئی کہ اگر میں بھی تھوڑی زور آزمائی کروں شاید بوسہ لینے کا موقع ہاتھ آ جائے۔ لیکن اس کے لیے طواف روک کر ادھر گھسنا پڑتا۔ حجر اسود کا بوسہ تو ایک چکر کے پورا ہونے پر ہے لیکن زیادہ تر لوگ اسے بغیر طواف کے ہی چومتے ہیں۔ انہیں ثواب بھی حاصل ہوتا ہوگا۔ لیکن انہی کی وجہ سے طواف کرنے والے حجر اسود تک نہیں پہنچ پاتے۔

طواف پورا کرنے کے بعد میں نے ملتزم تک پہنچنے کی کوشش کی اور اس کے آس پاس پہنچ بھی گیا۔ پھر کسی طرح حطیم میں داخلہ پایا۔ دو رکعت نفل نماز اس کے اندر پڑھی۔ ظہر بعد جب حرم سے باہر جا رہا تھا تو یہ احساس تھا کہ اس بار یہ کعبہ کا آخری دیدار ہے۔ پتہ نہیں قسمت میں دوبارہ آنا ہے یا نہیں۔ پتہ نہیں پھر طواف نصیب ہوگا یا نہیں۔ ایسے ماحول میں ناممکن ہے کہ دل پر اثر نہ ہو اور آنکھوں سے اس کا اظہار نہ ہو۔ پھر بھی جتنا میں نے خود سوچا تھا اتنا اثر نہیں تھا، شاید ذہن کئی دنوں سے اس کی پوشیدہ تیاری کر رہا تھا۔ جہاں تک کعبہ دکھائی دیتا ہے وہاں تک کوشش کی کہ ادھر پشت نہ ہونے پائے۔ تین گھنٹے بعد جب بس مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوئی تو دو بار حرم کے آس پاس سے گذری۔ منارے بھی دور تک نظر آتے رہے لیکن لوگوں پر میں نے جدائی کا بہت اثر نہیں دیکھا۔ شاید بیت اللہ سے بچھڑنے کے دکھ کا حساب مدینہ منورہ کی طرف بڑھنے کی خوشی کے برابر ہو گیا تھا۔

مدینے کا سفر ہے...

مدینہ شریف کی روانگی عصر بعد ہونی تھی ۔ نکلنے میں تاخیر نہ ہو اس خیال سے کہا گیا کہ آج عصر کی نماز کے لیے حرم نہ جائیں یہیں پڑھ لیں ۔ پھر بھی کچھ لوگ جانے سے خود کو روک نہ سکے ۔ میں حرم کے سامنے کی سڑک پر اجیاد کی سرنگ کے پاس کی چھوٹی سی مسجد کو روزانہ دیکھتا تھا جانے کا موقع نہیں تھا ۔ بھلا حرم چھوڑ کر یہاں کون جاتا ۔ ابھی موقع تھا ۔ یہ مسجد سامنے ہی تھی ۔ میں نے اسی میں عصر پڑھی ۔ ایک گنبد کی چھوٹی سی مسجد ہے پھر بھی اچھے خاصے نمازی اس میں تھے ۔ بس پر سامان بار ہوتے ہوتے اور سارے لوگوں کی گنتی کرتے کرتے تقریباً پانچ بج گئے ۔ کیونکہ کبھی کوئی کچھ کھانے پینے چلا جاتا تھا، کوئی دوسری بس میں جا بیٹھتا تھا ۔ کسی کو کوئی اور سامان خریدنا یاد آ جاتا تھا ۔ بالاخر ہمارا قافلہ ہوٹل سے روانہ ہوا ۔

نادر صاحب نے بتایا تھا کہ یہاں سے مدینہ کا رخ جاننا بہت آسان ہے ۔ صفا سے مروہ کی سیدھ میں بڑھتے چلے جایئے مدینہ پہنچ جائیں گے ۔ لیکن بس تو کہیں اور جا رہی تھی ۔ بس پہلے معلم کے پاس لے گئی ۔ یہاں بسوں میں بیٹھے لوگوں کا موازنہ ان کے پاسپورٹ سے کیا گیا ۔ تب تک مغرب کا وقت ہو گیا ۔ پاس کی ہی ایک مسجد میں نماز پڑھی گئی ۔ یہاں مسجدوں کے امام اور موذن حکومت سے تنخواہ پاتے ہیں اور اچھی خاصی پاتے ہیں ۔ سننے میں آیا کہ دور دراز کی مسجدوں کے امام صاحب اپنی ایک تہائی یا ایک چوتھائی تنخواہ میں کسی بنگلہ دیشی کو مقرر کر لیتے ہیں جو نمازیں پڑھاتا رہتا ہے ۔ کبھی کبھی وہ خود بھی آنے کی زحمت کرتے ہیں ۔

یہاں سے روانہ ہوئے تو سب کو یہ تشویش تھی کہ مدینہ شریف کب تک پہنچیں گے ۔

تقریباً 500 کلومیٹر کا سفر ہے لیکن حج کے ایام میں ٹریفک کی کثرت اور دو تین جگہ رک کر کچھ کاغذی کارروائی ہونے کی وجہ سے خاصی تاخیر سننے میں آئی تھی۔ ہم سے قبل طارق سجاد وغیرہ صاحبان کا گروپ گیا تھا جو ایک بجے دن میں چل کر تین بجے رات یعنی 13 گھنٹے میں پہنچا۔ ہماری ایک ہی خواہش تھی کہ کسی طرح فجر کی نماز سے قبل مدینہ منورہ پہنچ جائیں تاکہ فجر کی نماز مسجد نبوی میں نصیب ہو جائے۔ اس کے لیے پانچ بجے تک پہنچ جانا ضروری تھا۔ ایک عجیب تائید غیبی ہوئی کہ راستے میں کہیں ٹریفک نے پریشان نہیں کیا۔ جہاں بھی اندراجات کے لیے رکنا پڑا وہاں سو دو سو بسوں کی لمبی قطار کے بجائے بمشکل دو چار بسیں کھڑی تھیں۔ باقی یا تو آگے جا چکی تھیں یا پیچھے سے آنے والی تھیں۔ ہم بغیر کسی رکاوٹ کے نکلتے چلے گئے۔

بسیں جہاں رکتی تھیں وہاں حاجیوں کی ضیافت کا بھی کچھ نظم ہوتا تھا۔ کہیں ناشتے کا پیکٹ، کہیں زمزم کی بوتلیں اور کہیں کیسیٹ۔ یہ کیسیٹ بس کے لوگوں کی قومیت کا اندازہ کر کے اسی زبان میں دیے جاتے ہیں۔ ہماری بس میں اردو اور بنگلہ دونوں زبانوں کے کیسیٹ تقسیم ہوئے۔ ان کیسیٹوں کے دو موضوع ہیں یا تو مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی تاریخ بیان کرنا اور اس کے در پردہ یہاں کے بادشاہوں کی قصیدہ خوانی کرنا (جو بڑی چالاکی سے خود کو خادم حرمین شریفین کہتے ہیں) یا شرک اور بدعت۔

جہاں جہاں بس رکی وہاں بس کا دروازہ کھلنے یا باہر نکلنے پر یہ اندازہ ہوتا رہا کہ جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے جا رہے ہیں موسم نسبتاً خوشگوار بلکہ خنک ہوتا جا رہا ہے۔ عشاء کی نماز کے لیے ایک چیک پوسٹ پر رکے اور رات کے کھانے کے لیے سڑک کے کنارے کے ایک ہوٹل، یا اپنی اصطلاح میں کہیں تو اچھے قسم کے ڈھابے میں۔ ہمارا کھانا ہمارے ساتھ تھا، مٹن کا قیمہ اور روٹی۔ بہت سے لوگ اسے چھوڑ کر یہاں کا سادہ چاول اور ایک بے مزہ سا سالن کھا رہے تھے اور قرآن

پر ہمارا ایمان قوی ہو رہا تھا کیوں کہ کبھی کبھی بنی اسرائیل کے واقعات کا مطالعہ کرتے کرتے یہ وسوسہ بھی انسانی ذہن میں اٹھتا ہے کہ من وسلویٰ چھوڑ کر کوئی پیاز لہسن اور دال وغیرہ کی مانگ کیوں کرے گا بھلا؟

بس کو تین جگہ رکنا تھا اور اوسطاً دو گھنٹہ فی رکاوٹ کے حساب سے چھ گھنٹے کا اضافی وقت ہم نے جوڑ رکھا تھا۔ عام تاثر یہ تھا کہ صبح آٹھ نو بجے تک پہنچ پائیں گے۔ کچھ لوگ دس گیارہ بجے تک کا وقت بتاتے تھے، کیونکہ ان کا پرانا تجربہ یہی کہتا تھا۔ لیکن جب سڑک کے کنارے لگے بورڈوں نے مدینہ کے قریب آنے کے اشارے دینے شروع کر دیے اور ایک جگہ پر تو دس بارہ کلو میٹر دور سے ہی جگمگاہٹ دیکھ کر آگے بیٹھے ایک صاحب نے بے اختیار صدا دی ـــــ

''باآوازِ بلند درود شریف پڑھتے رہیے۔ مسجد نبوی کی روشنی دکھائی دے رہی ہے۔''

یہ رکسول کے وکیل اختر صاحب تھے۔ سرد موسم میں اچانک حرارت کی لہر سی پھیل گئی، آنکھیں کھڑکی کے شیشوں سے سٹ گئیں، زبان گویا ہوگئی، دل دھڑکنے لگا، دماغ آنے والی ساعتوں کی تیاری میں لگ گیا۔ وہ جگمگ کرتا ہوا دور کا نظارہ تو راستے کی بھول بھلیوں یا بڑی بڑی عمارتوں کے پیچھے چھپتا چلا گیا لیکن یہ احساس دل ودماغ پر حاوی ہوتا جا رہا تھا کہ اب پانچ دس منٹ میں ہی ہم وہاں ہوں گے جہاں پہنچنا بہت سے بڑے بڑے بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں ہوا۔ ہم اپنی سادہ لوحی میں جن کے نام کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ بھی لگا دیتے ہیں ان بادشاہوں کو بھی نہیں۔

نہ حاضری کا کوئی سلیقہ...

بس جس وقت سر بہ فلک عمارتوں کے درمیان رکی، رات کے ڈھائی بج رہے تھے اور بقیہ دو بسوں کا اب تک کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ دونوں گروپ لیڈر یعنی نفیس اور عتیق صاحبان کے بغیر ہم لوگ خود کو بے دست و پا محسوس کر رہے تھے۔ ٹھہرنے کی بکنگ کہاں ہے، کس سے بات کرنی ہوگی، کچھ بھی معلوم نہیں۔ اگر معلوم بھی ہو تو کوئی ذمہ دار آدمی ہی کسی سے گفتگو کرے گا۔ فون سے جانکاری ہوئی کہ دونوں بسیں آدھے پون گھنٹے میں آ جائیں گی۔ ان کے آنے تک ہم سب بس میں ہی بیٹھے رہے۔ سب کو ایک ہی فکر تھی جلد سے جلد سامان ٹھکانے لگائیں اور فجر کی نماز سے قبل مسجد نبوی میں موجود رہیں۔

نفیس صاحب اور عتیق صاحب نے آتے ہی گفتگو شروع کی۔ کاغذات کا تبادلہ اور ساتھ ہی ایک دوسرے کو سمجھانے کا عمل جاری رہا۔ تھوڑی دیر میں اندازہ ہوا کہ ہمارے پہنچنے کے متوقع وقت کے مطابق ہی بکنگ تھی جس کی مدت صبح نو بجے شروع ہوتی تھی اور اس میں ابھی چھ گھنٹے باقی تھے۔ اگر کمرے ابھی کھولے جائیں تو ایک دن کا کرایہ اور دینا ہوگا۔ ادھر کی دلیل تھی کہ ہم اپنی مرضی سے تو اس وقت آئے نہیں، معلم نے جب جیسے بھیجنے کا انتظام کیا ہم اسی کے پابند تھے۔ بہرحال طے ہوا کہ سامان نیچے اتارا جائے، لفٹ سے 11 ویں منزل پر پہنچایا جائے۔ جس کو جو کمرہ ملا ہے اسی بند کمرے کے سامنے وہ اپنا سامان چھوڑ دے اور مسجد چلا جائے۔

اسی دوران ہاتھ پیر سیدھے کرنے کی نیت سے بس سے نیچے آیا تو احساس ہوا کہ ـــــ

اُٹھی ہے جھوم کے بادِ صبا مدینے سے ـــــ سننے میں اور مدینے کی ٹھنڈی ہوا کا سامنا کرنے میں کتنا

فرق ہے۔ میں نے نادر صاحب کی ہدایت کے مطابق جو ہلکی گرم چادر ساتھ رکھ لی تھی وہ اس وقت میرے لیے بہت بڑی نعمت اور دوسروں کے لیے باعث رشک ثابت ہوئی۔ میں نے ذرا سی چہل قدمی کی تو پتہ چل گیا کہ یہ عمارت طیبہ ریسیڈنشیل سنٹر ہے۔ دو عمارتوں کے بیچ سے دیکھا تو مسجد نبوی کا دروازہ نمبر 17 سامنے دکھائی دے رہا تھا۔ خواہش ہوئی کہ سامان کی ایسی تیسی، کہیں نہ کہیں تو رہے گا ہی آ کر تلاش لوں گا، پہلے اندر داخل ہو جاؤں۔ پھر اس خواہش پر کسی طرح قابو پایا۔ سامان پہنچا کر ہم دوسری لفٹ سے نیچے آئے تو سامنے مسجدِ نبوی کا بابِ فہد یا دروازہ نمبر 21 تھا۔ اسی کو مسجدِ نبوی کا صدر دروازہ کہہ سکتے ہیں۔

جب ہم لوگ مسجدِ نبوی میں داخل ہوئے اس وقت تک پانچ بج چکے تھے۔ تصاویر میں اس کی بیرونی اور اندرونی جھلکیاں بہت دیکھ چکا تھا لیکن وہ سب اس عظیم الشان مسجد کے تعارف کے لیے ناکافی تھیں۔ جیسے جیسے کوئی شخص آگے بڑھتا جاتا ہے اس کی وسعت میں گم ہوتا جاتا ہے۔ طرزِ تعمیر سے لے کر اس کے رکھ رکھاؤ تک اور نقش و نگار سے لے کر یہاں پھیلی ہوئی روشنی تک سب کچھ ایک پر تقدس ماحول کی تشکیل میں معاون ہیں۔ میں آگے بڑھتا چلا گیا اور درمیانی حصے میں جگہ حاصل کی۔ دائیں بائیں آگے پیچھے ہر طرف پھیلے ہوئے زائرین کے اس سیلاب کو دیکھ کر سوچا کہ مکہ میں تو ہر شخص یہی کہتا تھا کہ جب تک آپ لوگ مدینہ پہنچیں گے تب تک تو کافی لوگ لوٹ چکے ہوں گے، آپ لوگ بہت سکون سے وہاں رہیں گے۔ پھر یہی سمجھ میں آیا کہ دو چار روز قبل آتے تو شاید مسجد کے اندر جگہ بھی نہ ملتی۔

ویسے مدینہ میں کبھی بے قابو بھیڑ نہیں ہوتی۔ حج کے بعد زائرین کو یہاں بھیجنے میں بڑے نظم و ضبط سے کام لیا جاتا ہے۔ یہاں عموماً آٹھ دن کا قیام رکھا جاتا ہے تاکہ مسجد نبوی میں چالیس وقت کی نماز پڑھنے کا موقع مل سکے۔ یہ حج سے قبل بھی ہوسکتا ہے اور حج کے بعد بھی۔ جو

پہلے آتے ہیں وہ مدینہ شریف کی حاضری کے بعد ہی حج کرتے ہیں اور جو بعد میں آتے ہیں حج کے فرائض انجام دینے کے بعد یہاں آتے ہیں۔اس سے یہاں کا نظام درست رہتا ہے۔ یہاں کی رہائشی سہولیات کے پیشِ نظر ہی ہر روز کتنے لوگ یہاں بھیجے جائیں اس کا فیصلہ ہوتا ہے۔اسی لیے آنے والوں کو دشواری نہیں ہوتی۔ یہاں ان کی رہائش کی جگہ مسجد نبوی سے چند میٹر سے لے کر چند کلو میٹر تک ہوسکتی ہے۔ ہم تو خوش قسمت تھے کہ ہماری عمارت کے بعد ہی مسجد نبوی کا صحن شروع ہو جاتا تھا۔اس سے زیادہ نزدیک رہائش کا کوئی تصور ہی نہیں ہوسکتا۔

روضہ رسول اللہ ﷺ کے محل وقوع کا اندازہ تو فجر کی نماز کے دوران ہی ہو گیا لیکن وہاں حاضری کے معینہ اوقات کا اندازہ نہیں تھا۔عورتوں اور مردوں کے لیے الگ الگ وقت ہے یہ بھی سنا تھا۔کئی ساتھی راستے میں گفتگو کرتے آرہے تھے کہ غسل کر کے اور نئے کپڑے پہن کر اہتمام سے جائیں گے۔ یہ بات مجھے بھی پسند آئی تھی اس لیے نماز کے بعد میں اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔کمرے میں میرے علاوہ دو لوگ اور تھے کولکاتا کے اسد عالم خاں اور گواہاٹی کے نوجوان منظور الٰہی ۔ طے ہوا کہ ظہر بعد زیارت کے لیے جائیں گے۔اسد بھائی تجربہ کار ہیں اس لیے ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ انہیں کے پیچھے چپکے رہنا ہے۔

ہم ظہر کے لیے نکلے تو مجھے یاد آیا کہ آج محرم کی پہلی تاریخ ہے ہجری سال کا پہلا دن اور ہم مدینہ منورہ میں مہاجر اعظم ﷺ اور ان کے رفیق کی آخری آرام گاہ کی زیارت کے لیے جارہے تھے۔ وہ مہاجر اعظم ﷺ جن کی ہجرت نے انسانیت کی تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ مجھے مدینہ کی ان بچیوں کی فی البدیہ فراست پر رشک آیا جو آپ ﷺ کا استقبال کرتی ہوئی گارہی تھیں۔

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع

وجب الشکر علینا مادعا للہ داع

حق ہے کہ یہ بدرِ کامل جو کفار مکہ کے گہن سے نکلا اور وداع کی گھاٹیوں سے مدینہ میں طلوع ہوا آج بھی ضوفگن ہے اور جس پر اس کے نور کی ایک ہلکی سی جھلک بھی پڑ گئی اس کی زندگی میں اماوس کا کوئی گزر نہیں۔

ظہر کی نماز کے فوراً بعد ہم تینوں باب السلام کی طرف بڑھے جو مسجد نبوی کے اگلے حصے میں بالکل دائیں ہے۔ وہاں موجود اہل کاروں نے راستہ بند کر رکھا تھا غالباً پہلے ہی کافی لوگ اندر جا چکے تھے۔ تھوڑی دیر تک ہم سامنے کھڑے انتظار کرتے رہے ہمارے ساتھ سیکڑوں لوگ انتظار میں تھے۔ ہمارے گروپ سے کچھ اور لوگ آ گئے تھے۔ ایک پاکستانی نوجوان اس بھیڑ میں ایک چھوٹی سی کتاب نکال کر روضۂ رسول اللہ ﷺ کے سامنے حاضری کے آداب اور وہاں پڑھنے کے لیے سلام کے الفاظ کی مشق کر رہا تھا۔ اس کے نزدیک ہمارے ساتھی عطا اللہ قریشی تھے۔ اس نے عطا اللہ سے گزارش کی وہ اسے دعا پڑھ کر سنا دیں تاکہ وہ صحیح تلفظ سمجھ سکے۔ اسی دوران دروازے پر تعینات عملے نے جانے کی اجازت دے دی۔

سب ایک ساتھ لپکے، چند لوگ دوڑ پڑے۔ پیچھے والوں نے ان کی پیروی کی۔ دھکا مکی شروع ہو گئی۔ میں بالکل دائیں طرف تھا پیچھے سے آنے والے غیر متوقع ریلے کو جھیل نہ سکا اور لڑکھڑا گیا۔ روکنے کی کوشش میں کلائی اور ہاتھ میں چوٹ لگی پھر بھی سینہ ایک ستون سے خاصی قوت سے ٹکرایا۔ پسلیوں میں کسی کی کہنی لگی، شاید اسی پاکستانی شخص کی جو اب حاضری کے آداب بھول چکا تھا اور سب سے آگے جانے والوں کی بھیڑ کا حصہ بن چکا تھا۔ ذہن میں کئی باتیں گردش کر رہی تھیں ـــــ شاید یہ دیر سے آنے کی سزا ہے، فجر کے وقت ہی چلے آنا تھا یا ناشتے کے بعد بھی آسکتا تھا، اتنی دیر نہیں کرنی چاہیے تھی ـــــ دل ہی دل میں معذرت کرتے ہوئے میں درود و سلام پڑھتی بھیڑ کے ساتھ دھیرے دھیرے ایک ایک انچ کھسکتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔

حضورﷺ کے روضے کی دیوار اور مسجدِ نبوی کے امام کے مصلے کے درمیان تین چار صف کی جگہ ہے۔ اسی جگہ سے زیارت کرنے والوں کا ہجوم مسجد کے دائیں سرے سے بائیں سرے تک جاتا ہے۔ حضور جس حجرے میں آرام فرما ہیں وہ مسجد نبوی کے بائیں سرے پر ہے۔ اس حجرے کی جس دیوار کے سامنے سے باب السلام سے آنے والے لوگ گزرتے ہیں اس میں تین محرابیں بنی ہوئی ہیں۔ تینوں کے سامنے ایک جیسے طلائی طغرے ہیں فرق یہ ہے کہ بیچ والے محراب کے ان طلائی حروف کے درمیان تین گول گول سنہری حلقے ہیں۔ یہی مواجہہ شریف ہے۔ پہلا حلقہ وہاں بنا ہے جہاں سے حضورﷺ کا چہرہ مبارک سامنے ہے۔ دوسرا حلقہ حضرت ابوبکرؓ کے چہرے کے سامنے ہے اور تیسرا حضرت عمرؓ کے چہرے کے سامنے ہے۔

یہاں سے گذرتے ہوئے ہر شخص رک جانا چاہتا ہے اور جتنی دیر تک ممکن ہو رکا رہنا چاہتا ہے۔ وہاں موجود عملہ کوشش کرتا ہے کہ لوگ چلتے رہیں زیادہ وقت نہ لیں۔ پیچھے سے آرہے لوگوں کی بھی یہی خواہش ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ وہاں پہنچ جاتے ہیں تو بھول جاتے ہیں کہ ان کے پیچھے سیکڑوں لوگ اپنی باری کے منتظر ہیں۔ میں بھی تھوڑی دیر رکا اگر چاہتا تو تھوڑی دیر اور رُکا رہتا لیکن سچائی یہ ہے کہ وہاں پر زیادہ دیر رُکنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ بچپن سے ہی بزرگوں کے سامنے بلانے پر جانے اور جتنا ضروری ہو اتنی ہی دیر رُکنے کی عادت ہے۔ پتہ نہیں کس خرابی ، کمزوری یا عیب پر نگاہ پڑ جائے یا کون سی غلطی انہیں یاد آجائے۔ یہ تو عمر میں اور رشتے کے بزرگوں کا معاملہ تھا۔ یہ تو وہ مقام ہے جہاں بزرگی کی انتہا ہو جاتی ہے۔ جن کے سامنے رعب سے بڑے بڑوں کی زبان گنگ ہو جاتی تھی۔ جید صحابہ کرام ان کے سامنے یوں ساکت بیٹھتے تھے گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں۔ دل میں بار بار یہی خیال آرہا تھا کہ یہاں مجھ جیسے گناہ گار کا دیر تک ٹھہرنا بھی بے ادبی ہے۔

مقدس وہ دیوار و در اللہ اللہ

کہتے ہیں مکہ معظمہ میں جلال ہے اور مدینہ منورہ میں جمال ہے۔ میں اس بات سے پوری طرح متفق نہیں ہو پاتا۔ جلال کے پس پردہ بھی جمال ہوتا ہے اور جمال کا رعب بھی جلال ہی ہے۔ چاندنی خواہ جتنی بھی ٹھنڈی لگے ہے تو سورج کا ہی پرتو۔ میرے خیال سے تو مکہ مکرمہ میں تحرک اور ہیجان زیادہ ہے اور مدینہ شریف میں سکون اور اطمینان۔ یہاں طواف نہیں ہے، سعی نہیں ہے، دوڑنا نہیں ہے، دیوانہ وار گھومنا نہیں ہے، تیزی سے لپکنا نہیں ہے، ایک بہت بڑے اژدہام میں اپنی جگہ نہیں بنانی ہے۔ اگر کوئی حج کے ارکان سے فارغ ہو کر اور مکہ معظمہ میں کچھ عرصہ گذار کر مدینہ پاک پہنچا ہے تو گویا اس مسافر کی مانند ہے جس کی کشتی ندی میں ایک پہاڑی علاقے سے گذر کر مسطح میدانی علاقے میں پہنچ گئی ہو۔ یہی فرق ایک اطمینان اور ٹھہراؤ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

جو یہاں حاضری کے آداب سے تھوڑا بہت بھی واقف ہے وہ روضۂ نبی ﷺ کے آس پاس خصوصاً، اور مسجد نبوی کے پورے علاقے میں عموماً، زور سے بولنے بھی سے گریز کرتا ہے۔ اہلِ دل حضرات تو قیام مدینہ کے دوران یہی احتیاط پورے شہر میں برتتے ہیں۔ میری نگاہ سے ایسے لوگ اکا دکا ہی گزرے جو حرم کے علاقے میں قہقہہ لگاتے یا چلا کر گفتگو کرتے دکھائی دیں اور اکا دکا کی کوئی سند نہیں۔ یہاں کی پولس بھی عموماً بہت نرمی سے پیش آتی ہے۔ میں نے مکہ معظمہ میں حرم کے باہر کی سڑک پر ٹریفک کے سپاہی کو اتنی زور سے ہوٹر بجاتے اور گاڑی میں لگے لاؤڈ اسپیکر پر اتنی بلند اور کرخت آواز سے ہدایات جاری کرتے دیکھا ہے کہ اس کی آواز دسویں

منزل پر بھی سنائی دیتی تھی۔ایسی آواز میں نے مدینہ منورہ میں کبھی نہیں سنی۔مجموعی طور پر یہ ساری باتیں مل جل کر شہر کا مزاج بناتی ہیں۔

یہاں کا مزاج پر سکون ہے لیکن اس میں جمود نہیں۔یہ سکون سمندر کی سطح کے سکون جیسا ہے جس کے نیچے لہروں کا تموج ہوتا ہے۔مسجد نبوی میں خاموشی سے بیٹھے ہوئے اشخاص اوپر سے ہی پُر سکون ہوتے ہیں۔اندر سے ہر وقت خواہشوں اور آرزوؤں کا سیلاب اُمنڈتا رہتا ہے ـــــ اگلی صف میں جگہ مل جائے ـــــ ریاض الجنۃ میں اطمینان سے وقت گذارنے کا موقع ملے ـــــ ستونِ عائشہ کے پاس نماز پڑھ لوں ـــــ پڑھ لی ہے تو پھر پڑھ لوں ـــــ روضۂ نبیؐ سے سٹ کر نفلیں پڑھ لوں ـــــ حضورِ قلب کے ساتھ روضہ پاک پر صلوٰۃ وسلام پیش کرلوں ـــــ ایک بار خواب ہی میں سہی حضورؐ کا دیدار ہو جائے ـــــ کہیں سے یہ تسلی ہو جائے کہ سلام قبول ہو گیا ـــــ کہیں سے یہ مژدہ مل جائے کہ عنقریب دوبارہ آنا نصیب ہوگا ـــــ جنت البقیع کی مٹی نصیب ہو جائے ـــــ اور ایسی ہی بہت سی باتیں! صرف آٹھ دن ٹھہرنے کی پابندی کے ساتھ یہاں آئے کسی حاجی کو کرید کر دیکھ لیں۔یہ ساری کی ساری حسرتیں جوالامکھی کے لاوے کی طرح پھوٹ پڑیں گی اور ساتھ ہی پھوٹ پڑے گا اشکوں کا سیلاب۔

مدینہ منورہ میں ہم لوگوں کے لیے سب سے اچھی بات تھی مسجد نبوی کے قریب ٹھہرنے کی جگہ۔یہ جگہ اتنی قریب تھی کہ اس کے اور مسجد نبوی کے درمیان کوئی دوسری عمارت نہیں تھی۔لفٹ سے نیچے آیئے اور آپ مسجد کے صحن میں ہیں۔یہ بہت اچھی بات تھی لیکن اس کا ایک منفی پہلو بھی تھا۔جو لوگ ایک دو کلومیٹر دور ٹھہرے تھے وہ فاصلہ طے کر کے آتے تھے اس لیے فوراً لوٹتے نہیں تھے۔حرم میں ہی زیادہ وقت گذارتے تھے۔ظہر میں آگئے تو مغرب تک یا عشا تک حدودِ مسجد ہی میں رہتے اور اپنے وقت کا بہترین مصرف لیتے۔ہم جیسے نزدیک والے

ہر نماز کے بعد کمرے میں لوٹ آتے تھے۔ ہاں فائدہ یہ تھا کہ اذان شروع ہونے کے بعد بھی وضو کرتے اور مسجد پہنچتے تو جماعت کھڑی ہوتے ہوتے کافی آگے کی صفوں میں شامل ہونے کا وقت مل جاتا تھا۔

صف میں شامل ہونے کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ اکثر نماز کے اوقات میں باہر کے صحن تک صفیں دکھائی دیتی ہیں۔ اس سے یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ اندر جگہ بھر چکی ہوگی۔ لیکن جلد ہی یہ اندازہ ہو گیا کہ بہت سے لوگ پیچھے کی صفوں میں ہی نماز پڑھنا پسند کرتے ہیں تا کہ وہ کم سے کم وقت میں اپنی اپنی مصروفیت پر لوٹ کر جا سکیں۔ اندر داخل ہونے پر بھی اندازہ ہوگا کہ بہت سے لوگوں نے اپنی اپنی جگہ طے کر رکھی ہے۔ وہ وہیں ٹکے رہتے ہیں خواہ آگے جگہ خالی ہی کیوں نہ ہو۔ ہم جیسے لوگ، جو جگہ دکھائی دینے پر اسے بھرنے کو آگے بڑھ آتے ہیں، کبھی کبھی تیس چالیس صف آگے پہنچ جاتے ہیں۔

مسجد نبوی کی وسعت اور گنجائش کا اندازہ باہر سے کرنا مشکل ہے۔ پانچ لاکھ سے زیادہ لوگ اس کے اندر نماز پڑھ سکتے ہیں۔ چاروں طرف پھیلے ہوئے صحن کو بھی شامل کر لیا تو مزید تین ساڑھے تین لاکھ کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ چھت کو شامل کر لیں تو اور ایک ڈیڑھ لاکھ کی تعداد اور بڑھ جائے۔ ہم لوگ جب یہاں آئے تب زائرین کی تعداد نسبتاً کم ہو چکی تھی۔ چھت خالی تھی اور صحن میں بھی وہی لوگ صفیں بناتے تھے جو اندر جانے کو تیار نہیں ہوتے۔ وہاں موجود عملہ کوشش کرتا ہے کہ لوگ اندر کی صفوں میں جگہ لیں۔ مگر لوگ تو لوگ ہیں!

مسجد نبوی کی موجودہ عمارت کئی ادوار میں مکمل ہوئی ہے۔ روضہ مبارک سے متصل عمارت مسجد نبوی کا وہ قدیم ترین حصہ ہے جو حضورﷺ کے وقت میں کھجور کے پتوں کی چھت ڈال کر بنایا گیا تھا اور خلافتِ راشدہ کے دور میں اس کی تعمیر و توسیع ہوئی۔ بعد کے ادوار میں اس کی حسن

کاری پر خصوصی توجہ دی گئی۔ اس کے بعد ترکی کے عثمانی سلاطین کی تعمیر کردہ عمارت ہے جو خصوصی طرزِ تعمیر کی وجہ سے ایک ممتاز مقام کی حامل ہے اور اس کے بعد سعودی دور میں ہوئی توسیع ہے۔ اس کو بھی ترکی طرز سے مشابہت رکھتے ہوئے تعمیر کیا گیا ہے۔ سامنے سے داخل ہونے والا شخص بابِ فہد سے داخل ہوکر سعودی توسیع سے گذرتا ہوا درمیانی حصے میں پہنچتا ہے اور باب مجید سے گذر کر عثمانی توسیع میں داخل ہوتا ہے اور اس سے گذرنے کے بعد مسجد نبوی کے قدیم ترین حصے تک پہنچتا ہے جو اپنے طرز تعمیر کے اعتبار سے ان دونوں سے کافی مختلف ہے۔ اسی حصے میں روضۂ مبارک سے متصل ریاض الجنۃ بھی ہے جہاں دو رکعت نماز پڑھ لینا بھی حاجی کی معراج ہے۔

مسجد نبوی کی خوبصورتی سب سے زیادہ اس کی محرابوں کی وجہ سے ہے۔ آپ کہیں بھی بیٹھے یا کھڑے ہیں اپنے آگے، پیچھے، دائیں، بائیں نگاہ اٹھائیے تاحدِ نگاہ محراب در محراب ایک ایسا نظارہ ہوگا جو اپنے سحر میں باندھ لے گا۔ ذرا باریکی سے غور کیجیے تو ہر حصے میں محراب اور پائے کے پتھروں کا رنگ بھی تھوڑا تھوڑا مختلف دکھائی دے گا۔ لیکن ایک چیز ریاض الجنۃ کو چھوڑ کر پوری مسجد میں ایک جیسی ہے۔ وہ ہے سرخ قالین۔ خوبصورت بیل بوٹوں والی سرخ زمین کی نرم قالین جو راستوں کو چھوڑ کر یہاں کے پورے فرش کو ڈھکے رہتی ہے۔ یہ قالینیں زیادہ بڑی بڑی نہیں ہیں۔ چوڑائی اتنی کہ اس پر نمازیوں کی دو صف کھڑی ہوسکے اور لمبائی اتنی کہ شانے سے شانہ ملا کر بارہ چودہ لوگ آجائیں۔ ریاض الجنۃ میں یہ قالین ہلکے ہرے رنگ کی بلکہ پستئی ہے۔ اسی سے شناخت ہوتی ہے کہ یہاں سے ریاض الجنۃ کی حد شروع ہوگئی۔

مسجد نبوی میں ایک طرف سے دوسری طرف آتے جاتے بیچ بیچ میں کھلے آسمان کا نظارہ ہوتا ہے۔ ایسے چوکور کھلے آنگن 27 کی تعداد میں ہیں اور ان کی لمبائی چوڑائی 75-70 فٹ

کے آس پاس ہوگی۔ ان کے ساتھ سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ جب صف بندی ہو جاتی ہے تو یہ کھلی چھت ایک بڑے سے گنبد میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ نماز کے بعد پھر یہ گنبد سرک کر پرے ہو جاتا ہے اور آسمان دکھائی دیتا ہے۔ ان بڑے بڑے گنبدوں کو آتے جاتے دیکھنا ایک یادگار تجربہ ہے۔ میں نے تجسس کے جذبے سے چھت پر جا کر ان گنبدوں کو دیکھا۔ لگا کہ یہ لکڑی سے بنائے گئے ہیں اور ہلکے ہیں اسی لیے لوہے کی پٹری پر پھسل کر چھت کی خالی جگہ کو ڈھک لیتے ہیں۔ یہ پورا نظام کمپیوٹر کے تابع ہے۔ اور موسم کے مطابق اسے استعمال کیا جاتا ہے۔

مسجد نبوی کی چھت پر ان گنبدوں کے علاوہ بھی ایک چیز کا مشاہدہ ضرور کرنا چاہیے۔ وہ ہے چھت کے اوپر نصب کیے گئے پتھر۔ جب میں اسد بھائی اور شمیم کے ساتھ چھت پر گیا تو اچھی خاصی سخت دھوپ تھی۔ لیکن یہ سفید سنگ مرمر جیسے پتھر اتنے ٹھنڈے تھے کہ ان پر تھوڑی دیر کھڑے رہنا بھی آسان نہ تھا۔ ان پتھروں کے ساتھ حاشیہ کے طور پر کم چوڑائی والے سیاہ پتھر بھی لگے ہیں۔ ان پر پاؤں رکھیے تو یہ خاصے گرم محسوس ہوں گے۔ آدھا تلوا سفید اور آدھا کالے پتھر پر رکھیے اور حیرت میں ڈوب جائیے۔ یہ خیال ضرور آیا کہ انہیں ٹھنڈا رکھنے کا کوئی مشینی نظام ہوگا لیکن ایسا کرنے کا کوئی فائدہ سمجھ میں نہیں آیا۔ نہ کوئی شخص وہاں ایسا دکھائی دیا جس سے اس سلسلے میں کوئی جانکاری حاصل ہو سکے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سخن سنجان طیبہ

نادر خاں سرگروہ صاحب نے مدینہ منورہ کے کچھ لوگوں کو فون کر کے میرا نام اور نمبر دے دیا تھا۔ اور ایک صاحب کا نمبر میرے پاس SMS کر دیا تھا، اس تاکید کے ساتھ کہ میں انہیں فون کروں۔ پہلے دن ذہن میں رہا ہی نہیں۔ دوسرے دن نادر صاحب کی یاددہانی پر میں نے فون لگایا تو دوسری طرف نعیم الحامد صاحب تھے۔ تھوڑی دیر کی گفتگو سے ہی اندازہ ہو گیا کہ انتہائی باعلم، باذوق، خلیق اور شفیق ہیں۔

اسی دن مغرب بعد انکا فون آیا۔ پوچھا ـــ ''کہاں ہیں؟'' میں نے کہا ـــ ''حرم میں۔'' ان کا سوال تھا ـــ ''عشاء کی نماز میں اب زیادہ وقت نہیں ہے۔ آپ زیادہ دیر تک تو وظائف نہیں پڑھتے؟'' میں نے پوچھا ـــ ''کیوں؟'' تو جواب ملا ـــ ''میں عشاء بعد مسجد بنوی کے باہر آپ کا انتظار کروں گا۔'' میں نے پوچھا ـــ ''حضرت میں آپ کو پہچانوں گا کیسے؟'' فرمایا ـــ ''میں باب فہد کے سامنے والی سڑک کے بیچ میں بنے گھڑی والے گول پارک کے پاس کھڑا رہوں گا۔ میرے ہاتھ میں ایک کتاب ہوگی جسے میں ہلاتا ہوں گا۔''

بتائی ہوئی جگہ اور طے کی ہوئی نشانی کے مطابق ملاقات ہوگئی۔ بڑی گرم جوشی سے ملے۔ گفتگو کرتے ہوئے وہ میرے ساتھ آگے بڑھتے رہے پھر انہوں نے ٹیکسی لی اور ہم تھوڑی دیر میں ان کے گھر پر تھے۔ انہوں نے راستے میں بتایا کہ انکا فلیٹ جہاں ہے وہاں کبھی قبیلہ اوس آباد تھا۔ اوس اور خزرج کا آپسی تنازعہ تاریخ کا حصہ ہے اور یہ بھی کہ حضورﷺ نے کیسے ان میں صلح کرادی پھر وہ کیسے شیر شکر ہو گئے۔

نعیم الحامد صاحب کا آبائی وطن مراد آباد اور موجودہ ملک پاکستان ہے۔ ویسے وہ پچاس سال سے سعودی عرب میں رہ رہے ہیں۔ اہلیہ یمنی ہیں، بچے عربی بولتے ہیں اور اردو نہیں سمجھتے۔ اس کے باوجود اندر داخل ہوتے ہی ایسا لگا جیسے یہی وہ گھر ہے جہاں اردو نے پناہ لے رکھی ہے۔ اچھا خاصہ کتب خانہ جس میں کتابیں رسائل و جرائد اس خوش سلیقگی سے آراستہ ہیں کہ بس! کمپیوٹر سے جڑا ایک بڑا سا اسکرین دیوار پر آویزاں ہے جس پر اردو کی ویب سائٹس اور فیس بک پر ڈالا ہوا مواد دور سے پڑھا جاتا ہے۔ نعیم صاحب نے بڑی محبت سے ساری چیزیں دکھائیں۔ ان کا اصل کام بیدلؔ عظیم آبادی پر ہے۔ تھوڑی بہت فارسی میں نے بھی پڑھ رکھی ہے اس لیے ان چیزوں کو دیکھتے سنتے بہت لطف آیا۔ پتہ نہیں کیسے مشتاق احمد یوسفی کا ذکر چھڑ گیا۔ یہ حضرت بھی نہ صرف شیدائے یوسفی نکلے بلکہ ان کے یوسفی صاحب سے قریبی تعلقات بھی ہیں۔ انہی سے جانکاری ملی کہ پندرہ برسوں سے شائقین جس کتاب کا انتظار کر رہے ہیں اس کے 2011ء میں شائع ہو جانے کے قوی امکانات ہیں۔ گفتگو میں تین گھنٹے کیسے گذرے مطلق احساس نہیں ہوا۔

مجھے یہ اندازہ یہاں آتے وقت ہو چکا تھا کہ یہ علاقہ شہر سے تھوڑا باہر ہے اس لیے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوٹنے کی فکر ہو رہی تھی۔ نعیم صاحب نے رات کے کھانے میں شریک ہونے کا اصرار کیا۔ میں تکلف سے کام لے رہا تھا کہ انہیں زحمت نہ ہو لیکن بعد میں احساس ہوا کہ بصورت دیگر میں اللہ کی کن کن رحمتوں سے محروم رہ جاتا۔ انہوں نے کہا کہ جو وہ روز رات کے کھانے میں لیتے ہیں وہی کھلائیں گے۔ دسترخوان پر اچھی طرح سکے ہوئے بریڈ کے ساتھ عمدہ قسم کا شہد، پنیر (سخت اور نرم دونوں طرح کی)، زیتون (سیاہ اور سبز)، تل سے بنی مخصوص عربی مٹھائی (جس میں تل زیادہ اور شکر کم تھی) اور بڑے جہازی سائز کے کپ میں بہترین چائے۔ میں نے سوچا کہ اگر اہتمام کرتے تو کیا منظر ہوتا۔ مجھے وہ بتا چکے تھے کہ ان کی

خوشدامن کی طبیعت ناساز ہے جس کی وجہ سے وہ اور ان کے اہل خانہ پریشان ہیں اس کے باوجود مجھے ایسا محسوس نہیں ہوا کہ ایک منٹ کے لیے ان کی توجہ مجھ سے ہٹی ہو۔تقریباً ساڑھے گیارہ بجے ان کے صاحبزادے اپنی گاڑی سے مجھے میری قیام گاہ تک چھوڑ گئے۔انہوں نے سائپرس میں ہوٹل مینجمنٹ کی تعلیم حاصل کی ہے اور انگریزی اچھی خاصی بول سکتے ہیں۔

دو روز بعد ایک نوجوان تشریف لائے۔ یہ فرحان عزیز تھے اور ان کو بھی نادر صاحب نے بہکا کر ادھر بھیجا تھا۔خوش مزاج،خوش اخلاق اور خوش فکر نکلے۔کمرے میں خاصی دیر ادبی فضا قائم رہی۔نعتیں اور غزلیں سنی سنائی جاتی رہیں۔مدینہ منورہ اور اطراف میں اردو کا ماحول زیر گفتگو رہا۔اور اس درمیان اسد بھائی کی حیرت میں اضافہ ہوتا رہا کیونکہ اتنے دنوں تک ساتھ رہنے کے باوجود انہیں میری ادبی سرگرمیوں کی کوئی بھنک نہیں لگی تھی۔

جانے سے ایک رات قبل اسی وسیلے سے ضمیر سیوانی تشریف لائے۔عرصے سے یہاں مقیم ہیں۔شعر فہمی اور شعر گوئی دونوں خوبیوں سے مزین،سنجیدہ،متین اور نرم خو ہیں۔چونکہ ان کا تعلق بھی بہار سے ہے اس لیے کئی دوست مشترک نکل آئے۔ان کا بھی ذکر خیر رہا۔اگر قیام کی مدت ختم نہ ہو رہی ہوتی تو یقیناً اور ملاقاتیں ہوتیں۔میں نے وعدہ لیا کہ آپ مدینہ منورہ میں مقیم ہیں دعا کرتے رہیے کہ بار بار آنا نصیب ہو اور ملاقاتیں ہوتی رہیں، انشاء اللہ تعالیٰ۔

یا مجید

مدینہ منورہ میں میرے لیے ایک بات بڑی اطمینان بخش تھی، وہ تھی وہاں کئی قریبی لوگوں کی موجودگی۔ میری مرحومہ اہلیہ کے بڑے بھائی عنایت اللہ جامعہ مدینہ میں غیر تدریسی ذمہ داریاں انجام دے رہے ہیں۔ ایک چچیرے بہنوئی شکیل احمد یہاں دواؤں کی مشہور دکان صیدلیہ النهدی میں ملازم ہیں۔ یہ دکانوں کا ایک سلسلہ ہے۔ میں نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں اس کی کم از کم دس بڑی بڑی دکانیں دیکھی ہیں، اور ظاہر ہے میں نے ان دونوں شہروں کا دس فیصد بھی نہیں دیکھا۔ ان کے علاوہ شمیم احمد بھی ہیں جو کئی برسوں سے یہیں جمے ہوئے ہیں۔ کئی کمپنیاں چھوڑ دیں لیکن مدینہ نہیں چھوڑا۔ یہ ایک رشتے سے داماد ہوتے ہیں لیکن اصل رشتہ پینتیس سال پرانی دوستی کا ہے۔

ایک عجیب اتفاق یہ ہوا کہ مدینہ منورہ میں اپنے حج کے قیام کا معینہ عرصہ گزار کر مکہ معظمہ لوٹ چکے شمیم منی اپنی اہلیہ اور بیٹے کے ساتھ پھر مدینہ واپس آ گئے تھے، کیونکہ انکی واپسی کی فلائٹ یہیں سے تھی۔ مزید خوشخبری یہ کہ تھی کہ بہار حج کمیٹی کی کارکردگی کے نتیجے میں انہیں اور ان کے گروپ کو مزید چار دن دیار نبوی میں ٹھہرنے کی سعادت حاصل ہو گئی تھی۔ دنیا میں کہیں بھی فلائٹ منسوخ ہونے کی وجہ سے مقررہ مدت سے زیادہ ٹھہرنے پر مجبور کیا جانا ایک اذیت ہو سکتی ہے لیکن مدینہ تو ہر مسلمان کے خوابوں کا شہر ہے۔ یہاں میعاد سے چار دن زیادہ رکنے سے بڑی راحت کا تصور نہیں ہو سکتا۔ زیادہ رکنے والے زیادہ تر لوگوں کی جیب خالی ہو چکی تھی، کھانے پینے کا انتظام حج کمیٹی کو کرنا پڑا ــــ لیکن قلبی آسودگی کا جیب سے کیا رشتہ؟

روضۂ پاک کے سامنے سے گزرنے اور سلام کرنے کا موقع کئی بار ملا۔ ہر بار پہلے سے زیادہ آسانی ہوئی۔ دو چار منٹ تک رکے رہنے میں بھی کامیابی ہوئی۔ اس سے زیادہ کا تصور ایام حج میں مشکل ہے۔ مواجہہ شریف کے سامنے جو سنہرے نقش و نگار ہیں ان میں اوپر یا اللّٰہ اور اس کے نیچے یا مجید بڑے خوبصورت طلائی حرفوں میں گڑھے ہوئے ہیں۔ بہ یک نظر کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی لیکن یا اللہ کے ساتھ یا مجید بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ دل مطمئن نہیں تھا لیکن دماغ نے کہا، ہوگی کوئی باریک وجہ۔ اتفاقاً ایک ساتھی مقامات مقدسہ کا ایک خوبصورت سا البم خرید لائے۔ اس کی ورق گردانی کرتے ہوئے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا کیونکہ مواجہہ شریف کی تصویروں میں یا اللّٰہ کے نیچے یا محمد (ﷺ) صاف صاف دکھائی دے رہا تھا۔ جو لوگ یہاں لمبی مدت سے رہ رہے ہیں ان سے بات کی تو پتہ چلا کہ یہ تبدیلی صرف تین سال پہلے کی گئی ہے۔ ہم لوگ تو خیر سے کائنات کے کسی گوشے میں یا رسول اللہ کہنے کے قائل ہیں لیکن روضہ نبوی کے آس پاس اور مسجد نبوی میں یا رسول اللہ کہنے پر تو سب کا اتفاق ہے پھر یہ کون سی ذہنیت ہے جس نے محمد (ﷺ) کے بیچ کی میم کو کاٹ کر برابر کیا اور تین نقطوں کا اضافہ اس صفائی سے کیا کہ کسی کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ کیا تبدیلی ہوگئی ہے۔ کچھ دن بعد میں نے انٹرنیٹ پر بھی اسی البم جیسی تصویر دیکھی۔ شاید کچھ عرصہ بعد نہ وہ البم دکھائی دے نہ انٹرنیٹ پر یہ تصویر۔

ہم دو تین لوگ کوشش کرتے تھے کہ مسجد نبوی کے قدیمی حصے اور ترکی تعمیر کے درمیان کی کھلی جگہ میں پہنچیں اور زیادہ وقت وہیں گزرے۔ اس کھلے صحن میں بھی وہ کھلنے اور بند ہونے والے بڑے بڑے چھاتے لگائے گئے ہیں جو یہاں کی خاص چیز ہیں۔ میں نے اس حصے کو ہمیشہ چھاتوں سے ڈھکا ہوا ہی دیکھا حالانکہ یہ نہ ہوتے تو یہاں سے سبز گنبد بالکل آنکھوں کے سامنے ہوتا۔ ہم نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ کہاں کہاں پر دو چھاتوں کے درمیانی خلا سے گنبد کا کچھ نہ کچھ حصہ

دکھائی دیتا ہے۔ہم اسی کو بہت سمجھتے اور یہیں جمے رہتے۔رات میں یہ دولت دیدار بھی چھن جاتی تھی کیوں کہ پتہ نہیں کیوں ہر طرف جگمگاتے ہوئے اس ماحول میں ایسا انتظام رکھا گیا ہے کہ روحانی روشنی کے منبع اس گنبد خضرا پر کہیں سے روشنی کی جھلک نہ پڑے۔کم از کم میرا مشاہدہ تو یہی ہے۔اس کو میں نے مسجد نبوی کی پشت پر جا کر بھی محسوس کیا جہاں سے پورا گنبد دکھائی دیتا ہے۔

مسجد نبوی کے وسیع و عریض علاقے میں کئی جگہوں پر نمازوں کے بعد درس کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔یہ کتابی درس نہیں ہوتا بلکہ کوئی مشہور عالم آ کر بیٹھتے ہیں اور انکے گرد ایک حلقہ سا بن جاتا ہے۔یہ ایک مستقل حلقہ ہوتا ہے ہر عالم کی جگہ مخصوص ہے ان کی کرسی بھی وہیں رہتی ہے اور قریب بیٹھنے والے بھی کم وبیش وہی رہتے ہیں۔ان کے اردگرد نماز سے فارغ ہو چکے لوگوں کا حلقہ ہوتا ہے جو آتے جاتے رہتے ہیں۔

میں کئی حلقوں کے آس پاس بیٹھا اور عربی نہ جاننے کے باوجود یہ سمجھنے میں مجھے دقت نہ ہوئی کہ ان کا موضوع اختلافی ہوتا ہے۔یہاں اکثر یہی دیکھا کہ حاضرین میں سے کوئی کچھ حدیثیں پڑھتا ہے یا کسی تفسیر کا کوئی حصہ پڑھتا ہے پھر عالم اس پر اپنی رائے دیتے ہیں۔اگر حاضرین مزید وضاحت کے لیے کوئی سوال کرتے ہیں تو عالم اس کا جواب بھی دیتے ہیں۔بظاہر یہ بڑا سیدھا سادہ عمل دکھائی دیتا ہے لیکن دو تین بار میں آپ کی سمجھ میں آ جائے گا کہ یہ سوال کرنے والے ایک خاص زاویے سے مسائل کو کریدتے ہیں اور ان کا عمومی نشانہ ہوتا ہے تقلید کا عقیدہ اور خصوصی نشانہ فقہ حنفی کی تنقید۔میں نے ایک دن ایک جگہ ایک عالم کو اردو میں ایسی ہی تقریر کرتے دیکھا لیکن غالباً یہ مستقل معاملہ نہیں تھا کیونکہ دوسرے دن اس جگہ ایسا کچھ دکھائی نہیں دیا۔میں نے دل میں کہا کہ یہ اچھا ہی ہے کہ یہاں غالب اکثریت عربی نہ سمجھنے والوں کی ہے اس لیے ان پر اس کے بداثرات نہیں پڑتے۔

وہ عالم سرشاری

روضۂ رسول اللہ ﷺ کی حاضری کے بعد سب سے بڑی خواہش ہر زائر کی یہی ہوتی ہے کہ ریاض الجنۃ میں نماز پڑھنا نصیب ہو جائے۔ انہیں مدینہ شریف میں مقیم حضرات پر رشک آتا ہے جو مسکراتے ہوئے فخر سے بتاتے ہیں کہ عام دنوں میں وہ بڑی آسانی سے جب چاہتے ہیں وہاں نفلیں پڑھ لیتے ہیں اور کبھی کبھی فرض نمازوں کے اوقات میں بھی وہاں جگہ پا جاتے ہیں لیکن ایام حج کی بات ہی دوسری ہے۔ کئی بار کی کوششوں میں آس پاس تو پہنچا لیکن سبز قالین تک رسائی نہیں ہو پائی۔ اس کے چاروں طرف وہاں کے اہل کاروں کی قلعہ بندی اتنی زبردست ہوتی ہے کہ اتنے ہی لوگ داخل ہو پاتے ہیں جتنے کی گنجائش ہے، اور یہی اچھا بھی ہے۔

بالآخر شمیم نے اپنا یہاں برسوں رہنے کا تجربہ استعمال کیا۔ کہا کہ رات کے گیارہ بجے وہاں داخل ہونے کی کوشش کریں گے۔ وہی کیا گیا۔ آدھے پون گھنٹے کی کوشش کے بعد آہستہ آہستہ کھسکتے ہوئے ریاض الجنۃ کی سبز قالین پر پاؤں رکھنا نصیب ہوا۔ مزید آدھے گھنٹے تک انتظار کرنے کے بعد نیت باندھ کر کھڑے ہونے بھر کی جگہ مل گئی۔ دو رکعت کے بعد پیچھے کھڑے شخص کے لیے جگہ خالی کرنا اخلاقی تقاضہ محسوس ہوا۔ گرچہ اس شخص نے منہ سے کچھ نہیں کہا تھا لیکن اگر آپ نگاہوں کی زبان سمجھ سکتے ہوں تو وہ سراپا درخواست تھا۔ اب اسے اتفاق کہیں یا عنایت کہ یہ دو رکعت نماز میں نے بالکل ستون عائشہ کے پاس ادا کی۔ جیسے ہی میں نے پیچھے والے شخص کے لیے جگہ خالی کی آگے کھڑے ایک وردی والے کارندے نے اشارے سے آگے بلایا۔ شاید اسے ایسا محسوس ہوا کہ میں دیر سے منتظر ہوں اور مجھے جگہ مل نہیں رہی ہے۔ میں بمشکل تمام اس

کے پاس پہنچا تو اسنے کھڑے ہونے بھر جگہ میرے لیے بنا دی۔ دو رکعت کے بعد سلام پھیرا تو شمیم پر نظر پڑی وہ روضۂ اطہر کی دیوار سے سٹ کر جگہ حاصل کر چکے تھے اور دو رکعت سے فارغ بھی ہو چکے تھے۔ شمیم نے اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ میرے پہنچنے پر اپنی جگہ میرے حوالے کر دی اور میں نے دو رکعت نماز یہاں پر بھی پڑھی۔ اس رات بستر پر آنے کے بعد بھی دیر تک نیند نہیں آئی۔ حیرت، مسرت، فرحت اور طمانیت کا ملا جلا جذبہ ہر چیز پر حاوی تھا۔ شاید اسی کو سرشاری کے عالم سے تعبیر کرتے ہیں۔

سرشاری کا یہ عالم مدینہ منورہ سے روانگی کے ایک دن قبل دوبالا ہو گیا جب عصر کی نماز سے قبل نہ صرف ریاض الجنۃ میں داخل ہونے کا موقع مل گیا بلکہ صف میں جگہ حاصل ہو گئی۔ نوافل کے علاوہ عصر کی نماز وہیں پڑھی۔ وہیں جمے رہ کر مغرب کی نماز بھی پڑھی۔ شاید عشاء کی نماز بھی یہیں پڑھ کر یہاں سے نکلتا لیکن اسد بھائی کا فون آ گیا تو وہ جگہ چھوڑنی پڑی۔ دراصل جب تک اس علاقے میں داخل ہونے کا موقع نہیں ملتا یا داخل ہو کر بھی نماز پڑھنے بھر جگہ حاصل نہیں ہوتی تو دل میں خیال آتا ہے کہ لوگ دوسروں کے لیے جگہ کیوں نہیں چھوڑتے۔ چار چھ رکعت نفل پڑھ کر بھی بیٹھے رہتے ہیں، انتظار میں کھڑے لوگوں کا خیال کیوں نہیں کرتے؟ لیکن جب خود جگہ مل جاتی ہے تو انسان کو اپنی کیفیت یاد نہیں رہتی۔ شاید میں ایسا نہیں کرتا لیکن وہاں موجود عملے نے اتنی دیر تک یہاں داخل ہونے کا راستہ بند کر رکھا تھا اور جو لوگ اس گھیرے کے اندر آ چکے تھے ان سے کہا تھا کہ صفوں میں اپنی جگہ پر بیٹھے رہیں۔

یہاں کا عملہ راستہ بند کرنے یا گھیرا بنانے کے لیے ایک قد آدم قنات کا سہارا لیتا ہے۔ یہ نرم کپڑے کے بجائے ترپال جیسا موٹا اور مضبوط ہوتا ہے جسے چٹائی کی طرح لپیٹ بھی سکتے ہیں۔ مسجد نبوی کا عملہ اپنے تجربے کی بنیاد پر خاص خاص اوقات میں اسی زبردست قنات سے گھیر

کر آنے جانے کے راستے پر اپنا قابو رکھتا ہے۔ اسی کی بدولت لوگ صرف اسی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہیں جدھر سے وہ چاہتے ہیں اور اسی کی وجہ سے اندر موجود لوگوں کو پہچان کر باہر بھی بھیجا جا سکتا ہے تاکہ مزید لوگوں کے لیے جگہ بنائی جا سکے۔

اس حفاظتی گھیرے کا سب سے شاندار استعمال عورتوں کو مردوں کی جماعت سے الگ رکھنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ مسجد حرام یعنی خانہ کعبہ کے اطراف میں عورتوں کی خاصی بڑی تعداد ہر طرف دکھائی دیتی ہے۔ طواف میں، سعی میں اور صفوں میں ہر جگہ لیکن مسجد نبوی میں کہیں ایک عورت بھی دکھائی نہیں دیتی۔ عورتیں تو یہاں بھی اتنی ہی ہوتی ہیں جتنی کہ مکہ معظمہ میں لیکن ان کے داخلے کا دروازہ الگ ہے اور باب النساء کہلاتا ہے۔ عورتیں اسی سے آتی جاتی ہیں۔ مسجد کے اندر بھی انہیں اسی حفاظتی گھیرے کی مدد سے انہیں مردوں کی جماعت سے بالکل الگ کر دیا جاتا ہے۔ عورتوں کے ساتھ بچوں کی موجودگی کی وجہ سے کبھی کبھی اس گھیرے کے پاس نماز پڑھ رہے مردوں کو ان کی موجودگی کا احساس ہو جاتا ہے۔ جن کے ساتھ مستورات ہوتی ہیں وہ پہلے سے طے کر لیتے ہیں کہ باہر نکلنے پر کہاں رک کر انتظار کرنا ہے۔ اس علیحدہ انتظام کا اثر یہاں کے پورے ماحول پر دکھائی دیتا ہے۔ یہاں کے بازاروں میں بھی عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلے میں برائے نام ہوتی ہے۔

آثار جدیدہ

مدینہ منورہ کے قیام کے دوران ایک پروگرام اور بھی طے تھا جس کی تاریخ روانگی سے دو دن قبل طے پائی، یہ تھا اطراف مدینہ کے اہم مقامات کی زیارت کا پروگرام۔ لیکن یہ پروگرام پہلے دن ٹل گیا کیوں کہ بس نہیں مل سکی بلکہ یہ کہا جائے کہ معقول کرایہ پر نہیں مل پائی۔ عتیق صاحب خالی ہاتھ لوٹ آئے مگر دوسرے دن کے لیے انتظام کر کے آئے تھے۔ دوسرے دن صبح صبح دو بسوں پر سب لوگ روانہ ہوئے اور مسجد قبا، مسجد قبلتین، سبعہ مساجد کے علاوہ غزوۂ احزاب کے وقت کھودی گئی خندق کی جگہ کو پہلی بار اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا سفر شروع ہوا۔

مسجد قبلتین وہ مسجد ہے جہاں نماز کے دوران حضورﷺ کی دعا قبول ہوئی۔ تبدیل قبلہ کا حکم نازل ہوا اور انہوں نے عین حالتِ نماز میں اپنا رخ بیت المقدس سے خانہ کعبہ کی طرف کر لیا۔ اس مسجد کی جدید تعمیر بہت شاندار ہے لیکن ہم اس میں اپنے قدیم ورثے کی جس جھلک کی تلاش میں گئے تھے وہ کہیں دکھائی نہ دی۔ اونچی عالیشان دیواریں، وسیع و کشادہ عمارت، بڑے گنبد، عمدہ نقاشی، دبیز قالین اور صفائی کے بہترین انتظامات کے باوجود کہیں کوئی کمی کھلتی رہی۔ پرانے حاجیوں نے بتایا کہ مسجد میں پہلے دو محراب بنے ہوئے تھے۔ قبلہ اول کی سمت کی نشاندہی بھی کی گئی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ دونوں کے رُخ میں کتنا فرق ہے۔ چند سال قبل ان نشانیوں کو مٹا کر نئی تعمیر کر دی گئی۔ پتہ نہیں جیسے جیسے لوگوں کے علم میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے ویسے ویسے یہاں کے ارباب اقتدار اور زیادہ مشکوک اور محتاط کیوں ہوتے جا رہے ہیں۔

کچھ ایسا ہی احساس سبعہ مساجد پہنچ کر بھی ہوا۔ یہاں پر بھی سات مسجدیں آس پاس

ہوا کرتی تھیں اسی وجہ سے یہ جگہ آج بھی سبعہ مساجد کہلاتی ہے لیکن مسجد سلمان فارسی، مجد علی اور مسجد فتح کو چھوڑ کر مسجد عمرؓ، مسجد ابو بکرؓ، مسجد سعد بن معاذ، مسجد فاطمہؓ وغیرہ کو شہید کر کے ایک بڑی مسجد میں ضم کرلیا گیا ہے۔ یہیں پر اس خندق کے تھوڑے سے آثار دکھائی دیتے ہیں جو حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورے سے کھودی گئی تھی۔ لوہے کی مضبوط جالی سے ادھر جانے کا راستہ بند ہے بس دور سے دیکھ سکتے ہیں۔ مسجد سلمان فارسیؓ اور مسجد فتح اسی سے متصل ایک چھوٹی پہاڑی پر ہیں۔ یہ بہت ہی چھوٹی مسجدیں ہیں جن میں پندرہ بیس لوگ ہی بیک وقت نماز پڑھ سکتے ہیں۔ لوگ دو رکعت نفل پڑھتے ہیں اور دوسروں کے لیے جگہ خالی کر دیتے ہیں۔ ان دونوں مسجدوں کی حالت اچھی نہیں ہے یا تو حکومت کی بے توجہی کی وجہ سے یا دانستہ۔ مسجد کے اندر اور باہر کی دیواروں پر لوگوں نے اس کثرت سے اپنے نام اور مقام ثبت کر رکھے ہیں کہ انہیں دیکھ کر ہندوستان کے تاریخی مقامات یاد آنے لگے۔ نام مقام بھی زیادہ تر ہندوستان پاکستان کے ہی تھے۔ اندر بھی صفوں کی جگہ پر معمولی چٹائیاں وہ بھی خستہ حال۔ شاید انتظامیہ چاہتی ہے کہ ان مساجد کو شہید کرنے کا الزام اس پر نہ آئے اور یہ اپنے طبعی انجام کو پہنچ جائیں۔

مسجد قبا بھی نہایت شاندار اور دیدہ زیب تعمیر کا نمونہ ہے لیکن اسلامی تاریخ کی پہلی مسجد ہونے جیسا کوئی احساس اسے دیکھ کر نہیں ابھرتا۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر مصر میں بھی ایسا ہی ماحول بنے اور اہرام کو توڑ کر کوئی فلک بوس عمارت بنادی جائے تو.....؟

یہ سفر زیارت صبح ناشتے کے بعد شروع ہوا تھا اور ہمیں ظہر کے وقت تک لوٹ آنا تھا تاکہ لوگ مسجدِ نبوی میں ظہر ادا کرسکیں۔ اسی لیے ہر مقام پر یہ اعلان ہوتا کہ زیادہ وقت نہ لگائیں، دس پندرہ منٹ میں لوٹ آئیں۔ پھر بھی کچھ لوگوں کے دیر سے آنے کی وجہ سے دیر ہوئی اس پر منتظم حضرات اور بس والے دونوں جھلاتے اور ایک بار تو دو تین لوگوں کو وہیں چھوڑ کر قافلہ

اگلے مقام کی طرف بڑھ گیا۔ وہ لوگ ٹیکسی سے وہاں پہنچے۔ لیکن ایک جگہ ایسی بھی تھی جہاں پہنچنے کے بعد بس والوں کو آگے بڑھنے کی کوئی جلدی نہ تھی۔ یہ چاکلیٹوں کی بہت بڑی دکان تھی۔ بیسوں کاؤنٹر پر الگ الگ قسم کے چاکلیٹ دستیاب تھے، خریدنے کے لیے بھی اور چکھنے کے لیے بھی۔

بس سے اترنے والوں کی پہلی دلچسپی تو اسی چکھنے والی بات میں تھی۔ اِس کاؤنٹر سے اُس کاؤنٹر پر جانا وہاں سے دوسرے کاؤنٹر پر جانا۔ ایک چاکلیٹ کے مزے کا موازنہ دوسری چاکلیٹ سے کرتے ہوئے آپس میں ان سے متعلق 'مزیدار' گفتگو کرنا۔ ان کاؤنٹروں پر موجود سیلز مین بھی ان کو پورا تعاون دے رہے تھے۔ مجھے نہ اپنا وزن بڑھانے کا شوق تھا نہ اپنے بیگ کا، پھر بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ اتنے کم وقت میں اتنا سارا چاکلیٹ میں نے پہلے کبھی نہیں کھایا تھا۔ ویسے وہاں کی خصوصیت وہ چاکلیٹ تھے جن میں کھجور کا استعمال ہوتا ہے۔ بہت دیر تک میں یہی سمجھتا رہا کہ آج ان کو چاکلیٹ چکھنے کی اجازت دینا مہنگا پڑے گا۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا لوگوں کے ہاتھوں میں پولی بیگ کا وزن بڑھتا گیا۔ دو بسوں پر سوار تقریباً ساٹھ لوگوں نے بلا مبالغہ دو کوئنٹل سے زیادہ چاکلیٹ خریدے تھے!

تازہ کھجوریں

حاجیوں کو مدینہ منورہ میں عام طور پر دو ہی کام ہوتے ہیں، عبادت اور خریداری۔ عبادت کا حال تو اللہ کو معلوم لیکن خریداری کا حال ساتھیوں کو بھی معلوم ہوتا ہے۔ ایک صاحب کوئی سامان لے کر آئے تھوڑی دیر میں اس کی قیمت اور ملنے کی جگہ سب کو پتہ چل گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ویسی ہی چیز کئی لوگوں کے پاس دکھائی دینے لگی۔ سب سے دلچسپ معاملہ ہوتا ہے جب کوئی آ کر بتائے ـــــ "آپ ستر ریال میں لائے تھے نہ، دیکھیے میں تیس ریال میں لایا ہوں۔" پھر شروع ہوتا ہے اصلی اور نقلی ثابت کرنے کا سلسلہ اور اس کے رنگ، روپ، وزن، فنشنگ وغیرہ کے حوالے سے بحثیں ہوتی رہتی ہیں۔

ویسے تو ہمارے گروپ والوں نے مکہ معظمہ سے ہی اچھی خاصی خریداری کر لی تھی بلکہ اس اضافی سامان کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو نئے بیگ یا کینوس کے بڑے بڑے مضبوط تھیلے بھی خریدنے پڑے اور ان کو مضبوطی سے باندھنے کے لیے نائلون کی رسیاں۔ کچھ تجربہ کار حضرات تو یہ سب ساتھ لے کر آئے تھے۔ جانماز، تسبیحیں، ٹوپیاں، عطر وغیرہ زیادہ تر لوگ مکہ میں خرید کر پیک کر چکے تھے۔ یہاں سے کئی لوگوں نے گھڑیاں، موبائل اور الکٹرانکس کے سامان خریدے یا پھر سونے کے زیورات۔ آج کل پوری دنیا میں سونے کی قیمت میں شاید زیادہ فرق نہ ہو لیکن یہاں خالص ہونے کی گارنٹی ہے۔ کئی لوگوں نے سونا خریدنے کے لیے کسی نہ کسی ذریعہ سے مزید لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ یہاں منگا لیا۔ یہاں دکانوں کے شوکیس میں سونا جیسے دعوت نظارہ دیتا رہتا ہے اسے دیکھ کر برداشت بھی مشکل ہے، خصوصاً جن کے ساتھ خواتین ہوں۔

میں صرف ایک ٹرالی بیگ لے کر گیا تھا، وہ بھی درمیانے سائز کا، اور یہ پکا ارادہ تھا کہ اس کے علاوہ صرف دو چیزیں ہوں گی ـــ زمزم اور کھجور ـــ تا کہ مجھے ان کی وجہ سے دشواری نہ ہو۔ بیگ یوں تو یہیں سے بھر کر گیا تھا لیکن ایک اچھی بات یہ تھی کہ اسی میں دو عدد کفن بھی تھے۔ جب قیام مکہ کے دوران میں نے یہ امانت رضوان کریمی کو سونپ دی تو اس میں ضرورت بھر جگہ بن گئی۔ زمزم کے لیے نفیس صاحب نے کسی سے بات کر رکھی تھی کہ وہ پندرہ لیٹر کے پلاسٹک کے جار میں بھر کر پہنچا دیگا اور پندرہ ریال لیگا۔ لیکن مدینہ منورہ روانہ ہونے سے ایک دن قبل اس نے انکار کر دیا۔ پتہ چلا کہ اس طرح زمزم بیچنے والے مقامی لوگوں پر پولس سختی کر رہی ہے۔ حاجیوں کو بھی ایک دو جار سے زیادہ بھرنے نہیں دیتی۔ سب کے پیسے جمع تھے وہ واپس ہو گئے۔

یہ سارا معاملہ ناشتے کے وقت ہوا تھا۔ چائے پیتے ہوئے میں نے اور اسد بھائی نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پروگرام طے پا گیا۔ پاس کی ایک دکان سے جار خریدا اور حضورﷺ کے آبائی مکان کے نزدیک زمزم بھرنے کے لیے لگائے گئے نلوں کے پاس پہنچ گئے۔ زیادہ بھیڑ بھاڑ بھی نہیں تھی۔ ہم اپنے اپنے جار لیے اپنے کمرے میں آ گئے، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اسد بھائی دونوں جار لیے کمرے تک آئے کیونکہ اپنی مدد کرنے کی عادت کے مطابق تین چوتھائی راستہ تو وہی دونوں جار اٹھائے ہوئے تھے۔ یہ سارا معاملہ آدھے گھنٹے میں نبٹ گیا اور جب ہم دوبارہ چائے پینے کی نیت سے ہوٹل کے بیسمنٹ میں پہنچے، جہاں کھانے پینے کا نظم تھا، تو کئی لوگ ابھی تک اسی مسئلے پر الجھے ہوئے تھے کہ زمزم حاصل کرنے کی کیا حکمت عملی اپنائی جائے۔ کچھ دور اندیش لوگ بہت اطمینان سے تھے۔ وہ کئی دنوں سے ہر نماز کے بعد بوتلوں میں پانی لا کر جار میں جمع کرتے جاتے تھے۔ اب ان کا جار بھر چکا تھا۔ لیکن لوگ تو لوگ ہی ہیں۔ کسی نے کہ دیا کہ یہ زمزم جو ٹھنڈا کر کے نلوں میں سپلائی ہوتا ہے یہ زیادہ دن رکھا نہیں جا سکتا، خراب ہو جاتا ہے۔ اب ان کے ماتھے پر بھی پریشانی کی شکنیں تھیں۔

کھجوریں مکہ معظمہ میں بھی دستیاب تھیں لیکن زیادہ تر لوگ اسے مدینہ منورہ سے ہی لیتے ہیں۔

مدینہ منورہ میں کھجور کے دو بازار ہیں — ایک عارضی اور ایک مستقل۔ خیموں والا عارضی بازار تو مسجد نبوی کے سامنے ایک ڈیڑھ کلومیٹر کی دوری پر لگتا ہے، لیکن مستقل بازار مسجد نبوی کی پیچھے نسبتاً کم دوری پر واقع ہے۔ یہاں بڑی چھوٹی چالیس سے زیادہ دکانیں ہیں اور ہر دکان میں کھجور کی بیسیوں اقسام۔ زیادہ تر لوگ تو 'عجوہ' تلاش کرتے ہوئے جاتے ہیں پھر درجن بھر قسم کی کھجوریں چکھنے کے بعد کنفیوز ہو جاتے ہیں۔ یہاں پندرہ بیس ریال سے لے کر ڈیڑھ سو ریال فی کلو تک طرح طرح کے کھجور دستیاب ہیں۔

یہاں کی خالی جگہوں پر عارضی دکانیں بھی لگ جاتی ہیں۔ ایسی ہی ایک عارضی دکان میں چار پانچ بوروں میں کھجور لیے ایک صحتمند بوڑھا عرب بیٹھا تھا۔ ہم ایک ہی کمرے کے تین لوگ ساتھ ساتھ تھے اور اس کی طرف متوجہ بھی نہیں تھے کیونکہ ہم نے کئی بڑی دکانوں میں کئی طرح کی کھجوریں دیکھی اور خریدی تھیں جن پر تبصرہ کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔ اس شخص نے اصرار کر کے ہمیں ایک کھجور چکھنے کو دی۔ منہ میں ڈالتے ہی سمجھ میں آ گیا کہ اس سے لذیذ کھجور ہمیں اب تک نہیں ملی۔ قیمت صرف پانچ ریال فی کلو! ہم نے اس سے دو کلو کھجور لیے تاکہ سب کو دکھا سکیں۔ یہ کھجور سب کے چکھتے چکھتے ہی ختم ہو گئی۔ دوبارہ نہ وہ بوڑھا عرب کہیں دکھائی نہیں دیا نہ اس کی دکان۔

کھجور کے بازار سے باہر آتے ہوئے ایک دکان پر تازہ کھجوریں دکھائی دیں، ہری شاخ میں لگی ہوئی۔ دیکھ کر حیرت ہوئی کیونکہ یہ کھجوروں کا موسم نہیں تھا۔ چھو کر دیکھنے سے پہلے ہی سمجھ میں آ گیا کہ یہ کولڈ اسٹوریج کا کرشمہ ہے۔ یہ مقدار میں کم تھیں اور خریدار زیادہ۔ ہم اسے خرید نہیں پائے۔ شمیم احمد ظہر سے عصر کے درمیان اپنے لنچ ٹائم میں تقریباً روز ہی آ جاتے تھے۔ ان کے سامنے یہ ذکر چھڑ گیا تو وہ دوسرے دن ویسی ہی کھجوریں لیے آ گئے۔ ہم لوگ اسے فریج میں رکھ کر کھاتے رہے۔ تھوڑا سا کسیلا پن ہونے کے باوجود اس کی شیرینی کمال کی تھی۔

کمروں میں میزان

کھجوریں یہاں ڈیپارٹمنٹل اسٹور سے لے کر شاپنگ مال تک ہر جگہ دستیاب تھیں۔ الگ الگ قسم کی اور مختلف وزن کی ایک سے بڑھ کر ایک نفیس پیکنگ میں۔ لوگوں نے تحفے میں دینے کے لیے یہاں سے بھی کافی خریداری کی تھی۔ ویسے ہمارے گروپ میں اسد عالم صاحب ہر جگہ یا تو عمدہ چاکلیٹ کی تلاش میں رہتے تھے یا بہترین قسم کی مونگ پھلی کی۔ ان کے پاس فرمائشوں کی لسٹ بھی لمبی تھی، جس میں فون سے اضافہ بھی ہوتا رہتا تھا۔ کمال کی بات یہ تھی کہ اس اضافے سے ان کی مسکراہٹ میں بھی اضافہ ہو جاتا تھا۔ دوسری طرف ایک گروپ تھا عطاء اللہ قریشی کا۔ یہ لوگ روسٹڈ چکن کے دیوانے تھے، خاص کر کے البیک کے تیار کیے ہوئے۔ یوں تو یہاں کے ایف سی۔ اور دیگر بین الاقوامی برانڈ کے تیار مرغ بھی ہر جگہ باسانی مل رہے تھے لیکن البیک کی مانگ زیادہ تھی۔

ایک دن اسی سلسلے میں گفتگو چل رہی تھی میں نے انہی لوگوں سے سنا ہوا جملہ دہرا دیا کہ 'لوگ یہاں لبّیک، لبّیک کہتے ہوئے آتے ہیں اور یہاں پہنچ کر البیک، البیک کہنے لگتے ہیں۔' تمام لوگوں نے اس جملے کا لطف لیا لیکن محمد احمد صاحب تجربہ کار شخص ہیں اور اسی ٹریولنگ کے پیشے میں ہیں، فوراً بولے ــــ

''یہ صحیح ہے کہ لوگ یہاں لبّیک، لبّیک کہتے ہوئے آتے ہیں اور یہاں پہنچ کر البیک، البیک کہنے لگتے ہیں، لیکن لوٹتے وقت دیکھیے گا، کولکاتا ائرپورٹ پر پیر رکھتے ہی سب کو صرف ایک ہی فکر ہوگی ــــ لال بیگ، کالا بیگ، لال بیگ، کالا بیگ!''

سامان باندھنے کی فکر شروع ہو ہی چکی تھی۔ خریداری کے شوق میں کس کو یاد رہتا ہے کہ بیگ میں جگہ کتنی ہے، نتیجے کے طور پر بیگ بھی خریدنے پڑے۔ اسد بھائی جیسے تجربہ کار لوگ یہ انتظام پہلے سے کر کے چلے تھے۔ ان کے پاس کینواس جیسے کپڑے کا مضبوط تھیلا تھا، جیسا ڈاک کے محکمے والوں کے پاس ہوتا ہے۔ ہر کمرے میں پیکنگ جاری تھی اور ساتھ ساتھ جاری تھی یہ بحث کہ کتنا سامان لے جانے کی اجازت ہے۔ حالانکہ نفیس صاحب نے کتنی بار کہا کہ 'جو بیگ آپ اپنے ساتھ رکھیں گے، یعنی کیبن بیگیج، اس کے علاوہ تیس کلو وزن کی ہی اجازت ہے، اس سے زیادہ پر پچاس ریال فی کلو کی اضافی ادائیگی کرنی پڑے گی' لیکن پھر کوئی یہ خبر لے آتا تھا کہ حاجیوں کے لیے وزن کی کوئی حد مقرر نہیں ہے اور پھر اطمینان کی ایک لہر پھیل جاتی تھی۔

ایک دن شمیم منعمی کے ساتھ اس عمارت وَردَۃُالاَبرار بھی جانا ہوا جہاں یہ لوگ حج کمیٹی کی طرف سے ٹھہرائے گئے تھے۔ یہیں حکومت بہار کے نوجوان، باصلاحیت، باکردار، نیک اور صالح افسر اے. اے. فیضی بھی ٹھہرے تھے جو سرکاری وفد کے رکن تھے۔ اڑیسہ کے ایک رٹائرڈ انجینیر صاحب بھی اپنی اہلیہ کے ساتھ تھے۔ انہوں نے دیگر سامانوں کے علاوہ بڑے سائز اور اچھی قسم کے چار کمبل بھی خرید لیے تھے۔ یہ چاروں کمبل ایک بڑے بنڈل کی شکل میں کمرے کے درمیان میں رکھے تھے جس کا سائز اور وزن اب ان کی پریشانی کا باعث تھا۔

ہر شخص کو فکر تھی کہ اس کے سامان کا وزن آخر ہے کتنا۔ ہمارے گروپ کے کچھ نوجوان فوراً اسپرنگ والا ترازو خرید لائے اور کمروں میں میزان قائم ہو گیا۔ ایک ایک بیگ اور سوٹ کیس بار بار تولا گیا۔ عام طور پر لوگوں کا خیال تھا کہ یہ آلہ خراب ہے اور وزن کو دس پندرہ کلو بڑھا کر بتاتا ہے۔ میرے پاس کل وزن انتیس کلو نکلا۔ میں مغرب بعد اسد بھائی کے ہمراہ نکلا اور ایک بیٹری سے چلنے والی سلائی مشین لے کر لوٹا جس کا وزن آدھا کلو سے بھی کم تھا۔

یقین سے نہیں کہہ سکتے

کوئی مدینہ منورہ جائے اور جنت البقیع کی زیارت نہ کرے یہ کیسے ممکن ہے۔لیکن یہ معینہ اوقات میں ہی ہوسکتا ہے۔ میں فجر کی نماز کے فوراً بعد مسجد نبوی کے باب بقیع سے باہر نکلا اور سامنے اس بابرکت جگہ کی طرف بڑھا جہاں نو امہات المومنین ،خاندان رسالت کے کئی افراد اور حضرت عثمانؓ کے علاوہ دس ہزار سے زیادہ تو صحابہ کرام دفن ہیں۔

یہاں چاروں طرف سے کافی اونچی اور مضبوط دیواریں ہیں اور مدینہ منورہ میں صرف یہیں پر مجھے کچھ ایسے سپاہی بھی دکھائی دیے جن کے ہاتھوں میں چھوٹے چھوٹے مگر بازوؤں جتنے موٹے بہت مضبوط ڈنڈے تھے۔اتفاق سے بھیڑ بہت زیادہ نہ تھی لیکن یہاں کی نسبتاً کم بھیڑ بھی بہت ہوتی ہے۔کتابوں میں درج تفصیلات میں یہاں کے مزارات کا تفصیلی ذکر ہے اور پرانی قلمی تصویروں، بلکہ کچھ پرانے فوٹو گراف میں بھی ان پر بنائے ہوئے قبے اور گنبد موجود ہیں۔ بہت سی کتابوں میں نقشہ بنا کر سمجھایا گیا ہے کہ کس احاطے میں اور کس چہار دیواری میں کن کن کے مزارات ہیں۔لیکن یہاں داخل ہوتے ہی ایک وسیع وعریض چٹیل ریگستانی میدان کا سامنا ہوتا ہے جس میں پیدل آنے جانے کی سڑکیں بنی ہوئی ہیں۔

یہاں آنے والے ہر ذی شعور شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ حضرت عثمانؓ یا اہل بیت اطہار کی قبروں کی زیارت کرے اور وہاں فاتحہ پڑھنے کی سعادت حاصل کرے۔جن کو جانکاری ہے یا جن کے پاس اس قبرستان کا خاکہ ہوتا ہے، جس میں ان قبروں کی نشاندہی کی ہوئی ہوتی ہے، وہ وہاں تک پہنچ بھی جاتے ہیں۔آج بھی وہاں مسمار کی گئی چہار دیواری یا عمارت

کے آثار موجود ہیں۔ لیکن اس جگہ پر پہنچتے ہی کسی مجاور، جاروب کش، گدی نشیں کے بجائے کچھ کرسی نشینوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ کہیں دو کہیں تین کی تعداد میں بیٹھے ان باریش لوگوں میں کم از کم ایک ایسا ضرور ہوتا ہے جو اردو اور بنگلا بولتا ہے۔ لوگ ان کو جانکار اور زائرین کی مدد کے لیے تعینات کیا ہوا شخص سمجھ کر تجسس کے مارے لپک اس کے قریب پہنچتے ہیں اور جانکاری حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ کیا حضرت عثمانؓ کی قبر یہی ہے؟

ان لوگوں کے پاس عموماً جواب کے طور پر رٹے ہوئے جملے ہوتے ہیں:

''ہو بھی سکتی ہے نہیں بھی ہو سکتی ہے۔''

''یقین سے نہیں کہہ سکتے۔ یقین سے نہیں کہہ سکتے۔''

''لوگ ایسا کہتے ہیں۔ ایسا مشہور ہے۔''

''واللہ اعلم۔ واللہ اعلم۔''

''کہیں سے بھی سب کے لیے دعا کر دو۔ کسی تخصیص کی ضرورت نہیں۔''

''قبرستان میں قران پڑھنا منع ہے۔''—— وغیرہ، وغیرہ۔

ایسے کئی لوگ گھوم گھوم کر یہی باتیں لوگوں کے گوش گزار کرتے رہتے ہیں۔ لیکن کم ہی لوگ ان کی باتوں پر کان دیتے ہیں۔ وہ ان کے سامنے ہی کھڑے ہو کر فاتحہ خوانی اور بڑے خشوع خضوع کے ساتھ ایصال ثواب اور دعا میں مصروف رہتے ہیں۔

لال بیگ کالا بیگ

واپسی کی تاریخ 15 دسمبر تو جانے سے پہلے ہی طے ہو چکی تھی۔ سوچا کہ شائد کوئی سبیل نکل آئے اور مدینے میں ایک دو روز مزید قیام کی کوئی صورت پیدا ہو جائے، لیکن کیا کریں ان پرائیویٹ ٹور والوں کا کام بڑا چوکس ہوتا ہے۔ رات ہی میں سب کو الٹی میٹم دے دیا تھا کہ فجر کی نماز کے فوراً بعد روانگی ہے۔ زیادہ تر لوگوں کی تیاری مکمل تھی۔ ہم لوگوں نے تو فجر کی نماز سے قبل ہی اپنے اپنے بیگ نیچے پہنچا دیے تھے۔ فجر کے بعد بس آ گئی اور سامان بار ہونا شروع ہو گیا لیکن یہ ایک وقت طلب کام تھا۔ اس درمیان سامان کو بس کی چھت پر پہنچانے والے بار بار 'بخشش' کی مانگ کرتے اور زیادہ تر لوگ نفیس صاحب کی طرف اشارہ کر دیتے۔ اس بیچ موقع دیکھ کر لوگ کئی بار روضۂ اقدس اور مسجد نبوی کی آخری جھلک پانے کے لیے گئے اور آئے۔

یہاں سے جاتے وقت صدقہ کرنا افضل ہے۔ میں نے رات ہی اپنے بچے ہوئے بڑے ریال نزدیک کے ہی ایک پرائیویٹ کاؤنٹر سے ہندوستانی روپیوں میں تبدیل کر لیے تھے۔ جو چھوٹے نوٹ بچ رہے تھے وہ مسجد نبوی کی خدمت کرنے والوں کے درمیان بانٹ دیے۔ آکر بس میں بیٹھا تو معلوم ہوا کہ نفیس صاحب نے اعلان کیا کہ صدقہ کے طور پر ہر شخص چار پانچ ریال کی رقم نکال دے تو وہ اکٹھی رقم ان باربرداروں کو بخشش کے طور دے دی جائے۔ پتہ چلا کہ اسد بھائی نے میری طرف سے بھی رقم دے دی ہے۔ خود انہوں نے مجھ سے یہ بات نہیں بتائی لیکن میں سوچتا رہا کہ دوسرے کی طرف سے صدقہ کرنے کا ثواب کتنا ہوتا ہوگا۔

بالآخر نو بجے بس جدّہ کے لیے چل پڑی۔ دیر تک اور دور تک مسجد نبوی اور مدینہ منورہ

کے آثار دکھائی دیتے رہے اور ایسی چھوٹی سے چھوٹی جھلک دیکھنے اور دوسروں کو دکھانے کی کوششیں بھی جاری رہیں۔ زیادہ تر لوگوں کے چہرے پر ایک طرح کی بجھی بجھی سی کیفیت تھی۔ مکہ معظمہ سے روانہ ہوتے وقت تو مدینہ منورہ پہنچنے کا اطمینان تھا لیکن یہاں سے چلتے وقت کسی کے چہرے پر گھر لوٹنے کی خوشی نہیں دکھائی دے رہی تھی۔

شہر سے باہر نکلنے کے بعد راستہ بالکل غیر آباد تھا۔ لمبی دوریاں طے کرنے کے بعد چھوٹی موٹی آبادی کی جھلک ملتی تھی۔ زیادہ تر پٹرول پمپ ہی دکھائی دیتے اور اس کے نزدیک دکانیں اور مسجد۔ حتیٰ یہ کہ اونٹ بھی بمشکل دکھائی دیے۔ عام طور پر بھوری اور مٹ میلی پہاڑیاں اور ویسی ہی زمین یہاں سے وہاں تک پھیلی تھی اور کہیں کہیں ببول کی جھاڑیاں۔ ہاں، سڑک بہت کشادہ، ہموار اور عمدہ۔ حیرت کی بات تھی کہ کہیں اسپیڈ بریکر بھی دکھائی نہیں دیا۔ شاید یہ لوگ ہماری طرح تھوڑی تھوڑی دور پر رفتار کو توڑنے کے نہیں بڑھانے کے قائل ہیں۔

رفتار بڑھانے کے اپنے فائدے اور نقصانات ہیں۔ فائدہ تو ہم اٹھا ہی رہے تھے نقصان بھی دیکھنے میں آ گیا۔ دو ڈھائی گھنٹے کے سفر کے بعد دو کاروں کو ایسی مڑی تڑی اور جلی بھنی حالت میں دیکھا کہ ان کے سواروں کی حالت پر تشویش ہونے لگی۔ اس حادثے کو دس بارہ منٹ سے زیادہ نہ گزرے ہوں گے کیونکہ آگ بجھائے جانے کے باوجود ابھی تک دونوں سے دھواں نکل رہا تھا۔ حیرت کی بات آگ بجھانے والا عملہ تھا جو پتہ نہیں کیسے یہاں پہنچ گیا۔ ایک ہیلی کاپٹر بھی زمین سے بلند ہوتا دکھائی دیا، جو شاید زخمیوں کو لے کر جا رہا تھا۔ ہماری بس جب ایک گھنٹے بعد ظہر کی نماز اور کھانے کے لیے ایک جگہ رکی تو کئی لوگوں پر اس حادثے کا اثر تھا۔ ہم ساڑھے تین بجے جدہ ائرپورٹ پہنچے۔ ائرپورٹ کا یہ حصہ حج ٹرمنل سے سے بالکل مختلف تھا۔ عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں ائرپورٹ کے اسی حصے میں موجود مسجد میں ادا کی گئیں۔ امام غالباً بنگلہ دیشی تھے۔

تقریباً ساڑھے دس بجے چیک ان کا مرحلہ شروع ہوا اور ساتھ ہی شروع ہوا گھنٹہ بھر چلنے والا ہائی ٹینشن ڈراما۔ اکثر لوگوں کے پاس وزن زیادہ تھا اور جیٹ ائرویز والے مقررہ وزن سے زیادہ سامان بغیر اضافی محصول کے قبول کرنے کو تیار نہیں تھے۔ شاید کوئی صورت نکل بھی آتی لیکن کچھ لوگ ان سے الجھ گئے اور انہیں دو چار کلو فاضل وزن پر بھی پچاس ریال فی کلو ادا کرنے پڑے۔ اسد بھائی کے پاس چھبیس کلو زیادہ سامان تھا جس میں کم از کم دس کلو تو چاکلیٹ رہا ہوگا۔ انہیں ایک ریال بھی نہیں دینا پڑا۔ دراصل مجھے وہیں پتہ چلا کہ میرا ٹکٹ بعد میں دوسری اسکیم کے تحت خریدا گیا تھا اس لیے میرے ساتھ دس کلو وزن زیادہ جا سکتا تھا۔ اسد بھائی کا بقیہ سولہ کلو کئی لوگوں نے بانٹ کر اپنے 'کیبن بیگیج' میں رکھ لیا۔

فجر سے قبل ہم ممبئی پہنچ چکے تھے۔ یہاں سے کولکاتا کی فلائٹ میں کئی گھنٹے کی تاخیر تھی۔ ہم ائرپورٹ سے باہر جا نہیں سکتے تھے سو یہیں اتنے دنوں کی رفاقت کے آخری چند گھنٹے مل بانٹ کر گزارنے لگے۔ نفیس صاحب کو سب کے کھانے پینے کی فکر تھی۔ ان کے مشورے سے ایک حاجی صاحب نے رات ہی ممبئی میں اپنے کسی رشتہ دار کو اطلاع دے دی تھی۔ وہ سویرے سویرے بہت سارا سامان لے کر آ گئے۔ نفیس صاحب نے بہت چاہا کہ وہ اس پر ہوا خرچ ان سے لے لیں لیکن کوئی بے وقوف ہی ہوگا جو ثواب کے بدلے پیسے قبول کرے۔ سامان اتنا تھا کہ ہم کوشش کے باوجود اسے ختم نہیں کر سکے۔ اب اس بچے ہوئے اچھے خاصے ناشتے اور مٹھائیوں کا اس ممبئی ائرپورٹ کیا کیا جائے، یہ سوال سب کے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔ نفیس صاحب نے وہ بڑا سا کارٹن اٹھایا اور وہاں تعینات سکیورٹی افسر کے پاس چلے گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں اللہ کا بھیجا ہوا وہ رزق ڈسٹ بن میں پھینکے جانے کے بجائے سکیورٹی والوں میں اور وہاں اگلی فلائٹ کے انتظار میں بیٹھے لوگوں کے درمیان تبرک کی طرح تقسیم ہو رہا تھا۔

جہاز ممبئی سے کولکاتا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ہر شخص خاموشی سے اپنی اپنی سیٹ میں سمٹا ہوا تھا۔ ہم گزشتہ تیس گھنٹوں سے سفر کی حالت میں تھے۔ لیکن اس کیفیت کو محض سفر کی تکان کہنا مناسب نہیں بلکہ یہ کئی کیفیات کا ایک ایسا مجموعہ تھا جس کی تشریح آسان نہیں۔ اس میں بیک وقت ارض مقدس سے واپسی کا افسوس، ایک تیزی سے بدلتا ہوا منظر نامہ، بچھڑتے ہوئے ساتھی، کل سے پیش آنے والی نئی مصروفیات، ایک بدلی ہوئی سماجی حیثیت، لوگوں کی توقعات، ایک احساس ذمہ داری اور پتہ نہیں کیا کیا شامل تھا۔

مسافت کا بڑا حصہ طے ہو چکا تھا۔ کولکاتا پہنچنے میں ابھی بھی آدھے گھنٹے کی دیر تھی۔ مغرب کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ لوگ ایک دوسرے سے اشاروں میں دریافت کر رہے تھے کہ کیا کیا جائے۔ کسی نے نفیس صاحب سے بھی دریافت کر لیا۔ ان کا جواب صاف تھا، ''وقت شروع ہو رہا ہے ختم تھوڑے ہی ہوا ہے۔ انشاءاللہ ہم وقت رہتے کولکاتا پہنچ جائیں گے اور جماعت بھی کرلیں گے۔'' زیادہ تر لوگ مطمئن ہو گئے لیکن کچھ لوگوں نے بیٹھے بیٹھے نیت باندھ لی۔

باہر آتے اندھیرا گھرنے لگا تھا لیکن ابھی بھی خاصی روشنی تھی۔ ہم لوگ اس کنویئر بیلٹ کی طرف بھاگے جہاں سے اپنا اپنا سامان حاصل کرنا تھا۔ سامان بہت آہستہ آہستہ آ رہا تھا پہلے کھجور، پھر زمزم اور سب سے آخر میں ٹرالی بیگ۔ اس دوران بہت سارا سامان کئی بار بیلٹ پر گھومتا رہا انہیں اٹھانے والا کوئی نہیں تھا۔ احساس ہوا کہ بشمول نفیس صاحب دس بارہ لوگ کہیں دکھائی نہیں دے رہے ہیں۔ جب وہ سب ایک ساتھ آتے دکھائی دیے تو فوراً سمجھ میں آ گیا کہ یہ کہیں پر مغرب کی جماعت قائم کر رہے تھے۔ ائرپورٹ کی عمارت سے نکلا تو عاشورہ کا چاند آسمان پر تھا۔ احساس ہوا کہ یہاں پہنچتے ہی مغرب کی پہلی نماز قضا ہو چکی ہے اور ہم میں سے بیشتر حاجی لال بیگ، کالا بیگ، لال بیگ، کالا بیگ میں الجھے رہ گئے!